خاکستر

بہار کوٹی

رائل ایجوکیشنل بک ڈپو - اردو بازار دہلی

بار اوّل نومبر ۱۹۳۵ء

تعداد طباعت ایک ہزار قیمت ۱۲؍

(خواجہ برقی پریس دہلی)
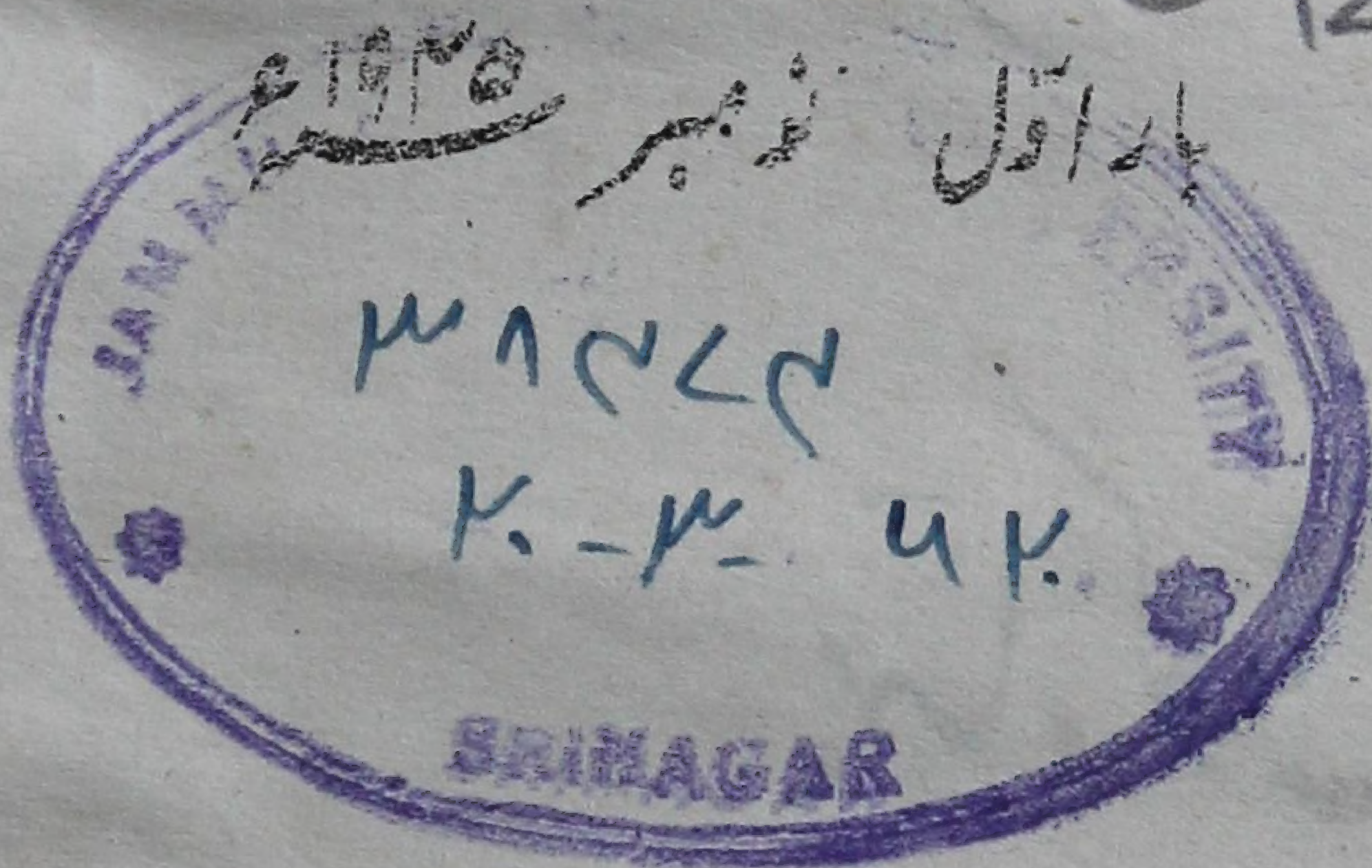
فہرس

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	چند باتیں از قیسی رامپوری	۵
۲	رکشا والا	۱۳
۳	معائنہ	۲۵
۴	جائزہ	۳۵
۵	گھروندہ	۴۳
۶	قیدی	۵۳
۷	شاعرہ	۶۱
۸	لغزش	۷۱
۹	روشنی	۸۳
۱۰	عذاب	۹۳
۱۱	قرض	۱۰۱

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۲	سفارش	۱۱۱
۱۳	جمالِ ہمنشیں	۱۲۱
۱۴	اندھیر نگری	۱۲۹
۱۵	یہ بہروپیے	۱۳۷
۱۶	کانٹا	۱۴۵
۱۷	بارِ دوش	۱۵۱
۱۸	مقدس گناہ	۱۵۹
۱۹	پھانس	۱۶۷
۲۰	حسین مغالطہ	۱۷۵

چند باتیں

گاندھی جی نے اُردو کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر ایسی تاریخی غلطی کی ہے کہ اس فاش غلط بیانی کو سامنے رکھ کر خطرہ ہے کہ آیندہ نسلیں کہیں ان کی لافانی قومی خدمات میں لغزشیں نہ ٹٹولنے لگیں۔ گاندھی بشریت میں ہمارے شریک ہیں لیکن وہ "مہاتما" ہیں اور ایک مہاتما کی لغزش دنیا کو تہ وبالا کر سکتی ہے۔ چنانچہ اُردو کی لسانی ہمہ گیری کے باب میں ان کی کوتاہ نظری کا یہ نتیجہ ہوا کہ کانگریس بھی اُردو کے خلاف متعصب ہوگئی اور اُردو کا وہ سکّہ جو ہندوستان کی روزمرہ کی زندگی میں بغیر پرکھے ہوئے چل رہا تھا کھوٹا جانے لگا اور اس کی جگہ ایسے سکّے آگئے جو نہ تو خود اپنی زبان سے اپنی قیمت بتا سکتے تھے اور نہ عوام کی ضرورت کو پورا کر سکتے تھے۔ پھر ان سکّوں نے اُردو کی ٹکسال ہی کو ختم کرنے کے لئے کھنکھنانا شروع کیا ـــــ انتشار پیدا ہوگیا، فضا مکدّر ہونے لگی اور سب کچھ سمجھانے اور سب جگہ سمجھی جانے والی بولی کا مُنھ بند کیا جانے لگا ـــــ یہ تمام ابتری ایک مہاتما کی غلطی کا نتیجہ تھی۔ اگر کسی غیر مہاتما سے یہ لغزش سرزد ہوتی تو کبھی مُلک میں لسانی طاعون نہ پھیلتا!

شکر ہے اس طاعون کا علاج گاندھی جی کے ہم مذہب مگر سمجھدار لوگوں ہی نے

کر دیا۔ ہندوؤں نے شروع ہی سے اُردو کو اپنی قومی زبان سمجھا تھا اور اس میں
انشا پردازی کے ایسے ایسے جوہر دکھلائے کہ اب تک ان کا شمار کلاسیکل لٹریچر میں ہوتا ہے۔
اور اب بھی اُردو کے ہندو افسانہ نگار، ایڈیٹر، شاعر اور ادیب اتنی کثیر تعداد میں ہیں
کہ اگر وہ خود یا ان کی نگارشیں گاندھی کی خدمت میں پہنچیں تو یقیناً وہ اپنے الفاظ واپس
لینے پر مجبور ہو جائیں ورنہ خجالت میں پناہ ڈھونڈھنے سے تو باز نہیں رہ سکتے۔

اس میں شک نہیں کہ بقول اقبالؔ ع

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

مگر حقیقت سے چشم پوشی ہوگی اگر یہ نہ کہا جائے کہ اُردو اب اُن حدود میں پہنچ
گئی ہے کہ اس کو دُنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔
اس میں انگریزی زبان کی سی گھُلاوٹ اور زور ہے، فرینچ کا سا لوچ و ہمہ گیری ہے
اور رُوسی زبان کی سی اُٹھان اور حقیقت نگاری ہے۔ اس میں سب کچھ ہے۔
غرض یہ تمام زبانوں کی دوست ہے اس کو کسی بولی سے تنفر، تعصب اور کھنچاوٹ
نہیں ہے۔

اُردو کی موجودہ غزلیں اور نظمیں اُٹھا کر دیکھئے اور ان کے سامنے دُنیا کی
آتشیں سے آتشیں، پُرسوز سے پُرسوز اور بڑی سے بڑی عکاسِ حقیقت شاعری
کو لے آیئے وہ اس سے بڑھی ہوئی نہیں تو کمتر بھی نہیں بیٹھے گی۔ یورپ کو اپنی
(بیانیہ) NARRATIVE اور (اظہاریہ) DESCRIPTIVE.
پوئٹری پر ناز ہے۔ اُردو میں ان ہر دو کے بلند ترین نمونے اقبالؔ کے ہاں موجود
ہیں۔ احساسی شاعری کی نادر مثال جوشؔ نے پیش کی ہے، فلسفے جیسے خشک موضوع

کو اقبالؔ نے نظم کا جامہ پہنا کر لطیف بنا دیا ہے۔ "فکریہ" شاعری کے جواب میں بہت سی نظمیں موجود ہیں اور دقیق سے دقیق انقلابی اشاریت کو ہمارے موجودہ شعرا نے دل کے قریب کر دیا ہے۔ اُردو کی بلینک ورس کی متنازعہ فیہ بحث میں نہیں پڑوں گا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ حالیؔ کی یہ کوشش بارآور ہوتی جا رہی ہے اور اس نے نظم اُردو میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا ہے۔

بہارؔ کے افسانوں کے مجموعہ "خاکستر" میں یہ سطور کچھ عجیب و غریب سی نظر آئیں گی مگر مجھے یقین ہے کہ میں بہارؔ کے افسانوں پر کمی کے ساتھ اظہارِ خیال کا جُرم کر کے بھی ان کی وسامت و افادیت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا رہا ہوں۔ اب تک زبانِ اُردو اور شاعری کا سرسری ذکر میں نے بیکار نہیں کیا ہے کیونکہ بہارؔ صاحب کی خاطرِ پسند یہ دونوں چیزیں ہیں۔ وہ اُردو کے عملی بہی خواہ ہیں۔ اور بہت اچھے شاعر ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں (جس کا جناب بہارؔ کو بھی اعتراف ہوگا) کہ وہ پہلے شاعر ہیں بعد میں افسانہ نگار۔ ان کی شاعری اور افسانہ نگاری کا فرق کچھ یوں سمجھئے جیسے دہلی کی جامع مسجد اور اس کے بچے ہوئے مسالے سے بنی ہوئی موتی مسجد

افسانہ نگاری پر طویل بحث کے لئے میرے ذہن میں کافی مواد ہے۔ وقتاً فوقتاً میں اُردو افسانہ نگاری پر اظہارِ خیال کرتا رہا ہوں اور میری وہ پُرانی شکایت اب تک بدستور برقرار ہے کہ مبتدیوں کی جب بسم اللہ ہوتی ہے تو افسانہ نگاری سے ہوتی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مضمون نگاری کے اندر پلاٹ ٹھونس دینے افسانہ بن جاتا ہے حالانکہ تمام انشا پردازیوں کے مقابلہ میں افسانہ اپنی بالکل ہی علیحدہ زبان رکھتا ہے، مختلف الفاظ رکھتا ہے اور دُوسرے ہی خیالات رکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے

کہ جس طرح غزل کا میدان بہت وسیع ہے اور اس میں بہت سی باتیں آجاتی ہیں اسی طرح افسانے میں بھی ESSAY یعنی انشائیت کی گنجائش ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بہت سے افسانے آجکل صرف انشائی انشا سے شروع ہوتے ہیں اور اسی پر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کو میں شریعتِ افسانہ نگاری میں ایک خود مختارانہ اجتہاد سے تعبیر کروں گا ورنہ دیکھا جائے تو فنی اعتبار سے یہ افسانوی عیب ہے۔ غزل اُسی وقت غزل ہے جب وہ شیریں زبان میں عورتوں سے باتیں کرتی ہے۔ اسی طرح افسانہ بھی اسی وقت افسانہ ہے جب وہ تخیلی کرداروں سے کہانی کہتا ہے۔ اگر افسانہ میں کہانی نہیں تو وہ سب کچھ ہے افسانہ نہیں ہے۔

میں افسانہ کو حقیقت گو کہنے کا روادار ہوں لیکن وہ اگر واقعاتی زبان میں بات کرتا ہے تو وہ ایک اپاہج افسانہ ہے۔ افسانہ میں جس قدر من گھڑت باتیں افسانوی حلاوت سے بیان کی جائیں گی، جس قدر وہ نرے تخیل کی پیداوار ہوگا جتنی اس میں دُور کی کوڑی لائی جائے گی اُتنا ہی اور اُسی قدر وہ مکمل افسانہ ہوگا۔ بظاہر یہ ایک دقیانوسی رائے معلوم ہوتی ہے مگر ہر فن اپنی جگہ پر دقیانوسی ہے!

میرے بیان کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مغربی افسانوں ور ناولوں کو پڑھئے۔ ان میں جو افسانے محض افسانے ہیں (صرف ایک STRAND میگزین کے افسانوں کو لے لیجئے) یا جو ناول محض ناول ہیں وہی وہاں افسانے یا ناول سمجھے جاتے ہیں۔ آپ ہی ایمان سے کہئے، سفر میں یا اسی قسم کی غیر دلچسپ اور کسی طرف لگی ہوئی اذیّت دہ گھڑیوں کو ختم کرنے کے لئے آپ کس قسم کا ناول پسند کرتے ہیں؟ اسی قسم کا جو ثقیل ساعتوں کو گزار دے یعنی آپ کی تمام توجہ جذب کرلے یعنی

رُوح و دِل کو اپیل کر رہا ہو، یعنی محض ناول ہو۔ یہ ہے مستعبد باتوں، تخیل کی ڈھکوسلا بازیوں اور کہانی کی قدرت!

لیکن مَیں یہ ضرور کہوں گا کہ اس خوش ذائقہ کھانے میں جو صرف لذّت کام و دہن بڑھاتا ہے، جسم میں طاقت پیدا نہیں کرتا یعنی محض پھوک ہے ڈیمن شامل کرنے چاہئیں۔ یہ حیاتین صداقت و حقیقت کو افسانہ میں ملانے سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ کل کا افسانہ ہمارے لئے خوش وقتی کا سامان فراہم کرتا رہا ہے آج کا افسانہ ہمیں ٹیسوں اور آنسوؤں سے بھی روشناس کرا رہا ہے اگر ہم صرف قہقہے ہی لگاتے رہے تو محض عیاش بنے رہ جائیں گے۔

باتوں ہی باتوں میں بہت آگے نکل گیا ہوں ابھی بہار کے افسانوں پر اظہارِ خیال کا ناگوار و ذمّہ دارانہ فرض باقی ہے۔ بہار چونکہ ایک حساس شاعر ہیں، ان کی کُھلی ہوئی آنکھوں کے سامنے اِس پُر از واقعات دُنیا کا کوئی بھی واقعہ آجاتا ہے تو وہ ان کے احساس و شعور کو متاثر کر دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ستار کا جب تار کسا ہوا ہوتا ہے تو (قطع نظر ترنم کے) زیادہ گونجدار سُر نکلتا ہے اور جب ڈھیلا ہوتا ہے تو آواز تو دیتا ہے لیکن اس میں گونج اور زور نہیں ہوتا۔ بہار کی رُوح کا بھی جس وقت تار تنا ہوا ہوتا ہے اس سے موزوں مصارع جھڑنے لگتے ہیں اور جب قدرے ڈھیلا ہوتا ہے تو اس سے واقعاتی افسانے نکلنے لگتے ہیں بہر نوع زخمہ اپنا کام کئے جاتا ہے۔

بہار کے افسانوں کو مَیں واقعاتی اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ان کی کہانیوں کے پلاٹ تخیّلی نہیں ہیں بلکہ ان میں واقعات کے پلاٹ بنے ہوئے ہیں۔ بہار کی زندگی

میں (بہار ہی کیا ہر شخص کی زندگی میں) حادثے اور سعید آتفاقات گزرے ہیں لیکن چونکہ وہ حساس بہت ہیں اور حساسیت کا نتیجہ قنوطیت ہے۔ اس لئے قنوطیت نے ان کے دل پر صرف حوادث نما واقعات کا نقش قائم کردیا اور دوسرے نقوش دھندلے کر دیئے۔

مَیں یہ تو حکم نہیں لگا سکتا کہ بہار صاحب کے سب افسانے تمام تر واقعات کی پیداوار ہیں لیکن یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بہت زیادہ واقعات پر مشتمل ہیں اور کم تخیل پر۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے افسانوی زبان میں کم بات کرتے ہیں۔ مَیں یہ کہہ تو رہا ہوں لیکن ان کے ایک افسانہ "کانٹا" نے مجھے ضغطہ میں مبتلا کر دیا ہے کیونکہ یہ افسانہ تخیل کی دولت سے بھی مالا مال ہے، مبالغہ کا افسانہ ساز فن بھی اس میں موجود ہے اور تمام تر افسانوی زبان کا بھی مالک ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بہار اپنی مشق و عادت کے مطابق حقیقت نگاری کے سلسلے میں اگر تخیلی کردار پیدا کرنا چاہیں تو بہ آسانی کر سکتے ہیں اور ان کو افسانوی زبان بھی عطا کر سکتے ہیں۔

بہار کے افسانوں پر اگر سخت سے سخت (نیک نیتی کے ساتھ) تنقید بھی کی جائے تو اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ان کے تمام افسانوں میں ایک سالم اسپرٹ موجود ہے۔ مَیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

بہار کی زبان کے باب میں کچھ لکھنا میں اس لیے برمحل نہیں سمجھتا کہ پورب باشی ہونے کے باوجود ان کے خاندان کی زبان اُردو رہی ہے۔ ہاں دوبارہ یہ ضرور کہوں گا کہ واقعاتی افسانہ نگاری کے سلسلہ میں وہ اپنے افسانوں کو افسانوی

زبان دینے سے قاصر رہ گئے ہیں۔ اس میں بہار کا کیا قصور ہے۔ TRUE STORY MAGAZINE کی زبان کو دیکھ لیجئے۔ کیسی کھری اور "داستان گو" قسم کی زبان ہوتی ہے اس کی۔

اب میں ٹیکنک کا جال پھیلا کر اس میں بہار کو الجھانا نہیں چاہتا۔ یہ کام ناقدینِ فن کا ہے اور میں ان کے "خاکستر" پر تنقید نہیں کر رہا ہوں۔ میں مقدمہ بھی تو نہیں لکھ رہا ہوں اور نہ تعارف۔ پھر آخر کر کیا رہا ہوں ——————— صرف تعمیلِ ارشاد۔ اور یہ امر دیانت کے منافی ہوگا اگر میں یہ نہ کہوں کہ بہار کے افسانے "تاثر" میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ خاص طور پر ان کا پہلا افسانہ "رکشا والا" یہ افسانہ نہ صرف متاثر کن ہے بلکہ اس میں ایک تڑپا دینے والی طنز بھی ہے۔ "دو قیدی" "لغزش" اور "فرض" وغیرہ اپنی جگہ بے حد اثر انگیز ہیں۔ بہار کے افسانوں کی کامیابی کا راز ان کے جذبات کی صداقت ہے۔ جس طرح وہ گفتگو اور کردار میں مخلص ہیں اسی طرح ان کا خلوص افسانوں میں نمایاں ہے۔

بہار شاید اٹھارہ انیس سال سے لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے نظم و نثر تنقید اور ترجمہ سب ہی میں طبع آزمائی کی ہے۔ بدقسمتی سے ان کو مگر اب تک ادبی ماحول نہ مل سکا تھا اس سلئے جس شہرت کے وہ صحیح مستحق ہیں وہ حاصل نہ کر سکے۔ اس میں کچھ ان کے نظری حجاب و انکسار کو بھی دخل ہے۔ اب وہ صاحبِ تصنیف کی حیثیت سے آپ کے

سامنے آرہے ہیں اور مجھے یقینِ کامل ہے کہ جلد اپنا صحیح مقام حاصل کرکے رہیں گے۔

قیسی رام پوری
اجمیر ۲۶ اگست ۱۹۴۵ء

رکشا والا

بوڑھا رکشا والا برگد کے سایہ میں اپنا رکشا لئے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کی متجسس نگاہیں راہگیروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ ہر قدم کی چاپ پر پکار اٹھتا "بابوجی رکشا والا" مگر اس پر کوئی نگاہِ غلط انداز بھی نہ ڈالتا تھا۔

تیز دھوپ میں بلند ترین شاخ پر بیٹھی ہوئی چیل کو دیکھ دیکھ کر بوڑھا خوش ہو رہا تھا اس لئے کہ چیل کے حرکات و سکنات میں سکون و طمانیت کی جھلک تھی جس کے لئے وہ ایک زمانہ سے ترسا کرتا تھا۔ وہ سوچنے لگا "کاش میں بھی پرند ہوتا جہاں جی چاہتا رہتا —— وجہ معاش سے بے فکر و آزاد ہو کر دنیا کی سیر کرتا پھرتا۔ تلاشِ معاش میں اتنی مشقت و جانفشانی سے نہ دوچار ہونا پڑتا۔ محنت تو خیر اختیاری چیز ہے اور میں محنت سے گھبراتا بھی نہیں مگر اس کا کیا علاج کہ دن دن بھر مزدوری ہی نہیں ملتی —— رہگیروں کا یہ خیال کتنا غلط ہے کہ بوڑھاپے کی کمزوری کے باعث میں تیز نہیں بھاگ سکتا —— بے شک مجھ میں پہلی جیسی

پھرتی نہیں رہی لیکن سواریوں کو خوش کرنے کے لئے اب بھی میں کسی رکشا والے سے کم تیز نہیں دوڑتا۔ مالک مجھ سے صرف اس لئے ناخوش رہتے ہیں۔ کہ میں زیادہ پیسے نہیں کما سکتا۔ بھلا اس میں میرا کیا قصور ہے۔ سواریاں مجھے کمزور اور بوڑھا سمجھ کر میرے رکشا میں بیٹھنا پسند ہی نہیں کرتیں۔ آج اب تک کوڑی پلے نہیں پڑی۔ اگر شام تک یہی حال رہا تو خیر نہیں۔ مالک مجھے کل ضرور نکال دیں گے۔ میرا کو ہر وقت یہی خیال رہتا ہے کہ میں کب نکالا جاؤں کہ اُسے ملازمت ملے۔ رکشا والے کی آنکھیں اسی تصور سے پُرنم ہوگئیں۔ اُس نے پھر چیل کی طرف دیکھا جو بدستور اطمینان کے سانس لے رہی تھی۔ شاید اس کی دُنیا میں قنوطیت کا دخل ہی نہ تھا۔

جمیل نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے شاہد سے کہا "بلا کی گرمی ہے اور گھر دور آؤ رکشا پر چلیں گے"۔ بوڑھا رکشا والا پہلے ہی اشارے پر جھپٹ کر آگیا "کہاں لے چلوں بابوجی؟" "جمالی چوک" جمیل نے تحکمانہ لہجہ میں کہا اور رکشا والا روانہ ہوگیا۔ بوڑھا واقعی بڑا جواں ہمت تھا۔ وہ بہت تیز دوڑ رہا تھا۔ اُس کے گھٹنوں سے زور زور سے چٹخنے کی آواز فضا میں گونج گئی۔ وہ بھاگ رہا تھا اتنا تیز جس کی اُس جیسے عمر انسان سے توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ کہیں ذرا آتا تو بوڑھے کے قدم سست پڑنے لگتے اور جمیل کی آواز تیز "کیوں موت آرہی ہے۔ ایسے ہی چلایا کرتے ہوں گے رکشا۔ اچھا لینا پیسے بدمعاش"۔

بوڑھا پوری قوت سے تیز بھاگنے لگتا۔ رکشا چلتا رہا، رکشا والا بھاگتا ہانپتا اور کانپتا رہا۔ دھوپ تیز ہوتی رہی۔ پسینہ ٹپکتا رہا لیکن شاہد خموش تھا۔ کھویا ہوا۔

وہ سوچ رہا تھا "کتنا جاں گسل ہے یہ منظر کتنی جاں فرسا ہیں یہ گھڑیاں۔ کتنا سخت جاں ہے یہ بوڑھا۔ کتنے سنگ دِل ہیں رکشا پر بیٹھنے والے۔ کتنی ستم ظریف ہے یہ فطرت۔ کتنی عجیب و غریب ہے قدرت کی تقسیم۔ ایک رکشا پر بیٹھا ہوا ہے۔ دُوسرا چلچلاتی دُھوپ میں بیلوں کی طرح رکشا کھینچ رہا ہے۔ ایک اس لئے جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتا ہے کہ خسخانۂ برفاب کا لُطف اُٹھائے۔ دُوسرا دھوپ میں اس لئے جُھلس رہا ہے کہ جب وہ دِن بھر کا تھکا ہارا رات کو اپنے جھونپڑے پر پہنچے تو اُس کی جیب میں کم سے کم اتنے سکے ہوں کہ وہ رُوکھی سُوکھی روٹیوں سے دیوِ اشتہا کو تسکین دے سکے۔ شاہد فطرتاً فلسفی تھا۔ ایک رقیق القلب فلسفی۔ متفکر۔ ایک حسّاس متفکر۔ مبصر ایک دردمند مبصر۔ اس منظر سے اُس کے سازِ ہستی کا ہر تار تھر تھرا اُٹھا۔ وہ غریب گھر میں پیدا ہوا تھا — وہ غریبی کی تکالیف سے آشنا تھا — اس کے برخلاف جمیل سرمایہ دار تھا۔ سرمایہ پرست اور سرمایہ داری کا موید و مداح — ساتھ ہی ساتھ وہ مصوّر تھا اور چابک دست اُس نے قومی لیڈر ہونے کی حیثیت سے بھی کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ مگر ۔ ۔ ۔ ۔ اُس کے باطن اور ظاہر میں تضاد تھا — تضاد جو نظر تو آجاتا ہے لیکن جس کا ذِکر زبان تک نہیں آتا۔ نہیں آنے دیا جاتا۔

رکشا شاہد کے مکان کے پاس آکر رُک گیا۔ جمیل نے ایک چوّنی نکال کر رکشا والے کے حوالے کی۔ رکشا والے نے گڑگڑا کر کہا۔ "حضور مزدوری بہت کم ہے تین میل کا فاصلہ —۔ بُوڑھا ہوں حضور۔ غریب ہوں مالک۔ پرماتما بھلا کریں۔"

جمیل نے ڈپٹ کر کہا "اُلّو کہیں کا۔ چوّنی دیکھ کر دماغ چل بڑا۔ چل دے

جلدی کر۔ جلدی — دیکھ ورنہ یہ بھی چھن جائے گی۔"

شاہد مکان کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ رکشا والا اب تک وہیں کھڑا ہوا ہے واپس آیا اور جیب سے ایک اٹھنی نکال کر بوڑھے کے ہاتھ میں رکھ دی۔ بوڑھے نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے دعائیں دیں۔ شاہد نے پوچھا "کیا نام ہے تمھارا کتنا کما لیتے ہو روز۔ کتنے بچے ہیں۔" بوڑھے نے جواب دیا "راما نام ہے حضور، روز تین چار آنے کے پیسے مالک دے دیا کرتے ہیں سرکار۔ ایک بچی ہے مالک چھوٹی سی تھی کہ اس کی ماں مرگئی۔" "اچھا جاؤ" شاہد نے کہا اور کمرے میں داخل ہوگیا — رکشا والے کے جاتے ہی جمیل شاہد پر برس پڑا "جب مناسب مزدوری چکا دی گئی تھی تو آپ کو مزید داد بخشش دینے کا کیا حق حاصل تھا — تم جیسے نام نہاد حاتموں کی اُصولی بے ضابطگیوں نے سخاوت کے نام کو بٹہ لگا دیا — نظامِ اقتصادیات کی برہم زدگی تم جیسے برخود غلط سخیوں کی رہین منت ہے۔" جمیل یہیں تک کہنے پایا تھا کہ چائے آگئی۔ شاہد نے مسکراتے ہوئے کہا "چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے اسے پی کر حواس مجتمع کر لیجئے — چائے پینے کے بعد آپ کی طلاقتِ بیانی بڑھ جائے گی اور آپ پُرزور طور پر گالیاں دے سکیں گے۔"

جمیل نے چائے کی پیالی سنبھالتے ہوئے کہا "شاہد تم نہیں سمجھ سکتے ان نکات کو، تم کیا جانو دنیا کس دَور سے گزر رہی ہے۔ تمھیں تو دفتر جانا۔ مشین نما طریقہ پر فائلیں ٹٹولنا۔ کھانا کھا کر سو جانا یا پھر زیادہ سے زیادہ کسی بچے کو کھلا لینا یا بیگم کی فرمائشات کی خرید و فروخت کے لئے چوک تک چلے جانا۔ یہ بھی کوئی

زندگی ہے۔ آخر انسان وحیوان میں کچھ تو فرق ہونا چاہیئے۔" شاہد سب کچھ سُن کر خاموش تھا۔ وہ جمیل کی ڈھٹائی پر حیرت کر رہا تھا۔ وہ اور جمیل عرصہ تک ہم جماعت رہ چکے تھے۔ جمیل کو اس حقیقت کا کماحقہٗ علم تھا کہ وہ (شاہد) طالب علمی کے زمانہ میں اپنی غیر معمولی ذہانت و فطانت پر تمام اسکول میں رشک و رقابت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ جمیل کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ فطرتاً خاموش ہونے کے باوجود کالج کا بہترین مقرر سمجھا جاتا تھا۔ اس خیال سے کہ جمیل دیدہ و دانستہ حقائق پر پردہ ڈال رہا ہے، شاہد بلک اٹھا۔ اس نے جمیل کو نظروں میں جذب کر لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "آپ ذرا سی بات پر ناراض ہو گئے۔ واللہ میرا ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ اپنے تموّل کا مظاہرہ کروں یا آپ کو نیچا دکھاؤں، مَیں کیا اور میرا تموّل کیا ـــــ مَیں نے رکشا والے کو ضعیف و ناتواں دیکھ کر اس کی مدد کرنا ضروری سمجھا۔ آپ نے دیکھا نہیں وہ کتنا خستہ حال تھا۔ اس کی پیشانی کی ہر شکن، اُس کے پچکے ہوئے گالوں کی ہر جھری، اس کی نظر کی ہر گردش چیخ تھی۔ بے پناہ چیخ۔ وہ سوال تھا۔ سراپا سوال۔ اُسے مَیں نے کچھ نہیں دیا۔ بلکہ اُس نے مجھے بہت کچھ دیا۔ مَیں محسوس کر رہا ہوں کہ اُسے چاندی کا ایک بے مقدار سکّہ دے کر مَیں نے بہت کچھ پا لیا۔ تم اسے حماقت پر محمول کرو گے۔ کیونکہ قومی لیڈروں کا یہی وطیرہ ہے لیکن مَیں نے چند ٹکوں میں طمانیت جیسی نعمت خریدی۔ ایسی طمانیت جس کی قیمت کوئی نہیں دے سکتا۔ تم نے غور نہیں کیا اٹھنّی پانے کے بعد وہ کتنا مسرور تھا۔ اور نہ تم نے یہی دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائی کہ اُسے مسرور دیکھ کر میری مسرت کا کیا عالم تھا۔ بخدا میری روح فرطِ مسرت

سے رقصاں تھی۔ میری آنکھیں اب تک مسرت کے آنسوؤں سے نم ہیں۔ مگر آہ، تم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔ آہ اب تم لیڈر ہو چکے ہو۔ اب تمھاری ہمدردی وہ ہمدردی نہیں جو شرمندۂ معنی ہو سکے۔ اب تمھارا مصرف صرف یہ رہ گیا ہے کہ بوقتِ ضرورت اسٹیج کو زینت بخش دیا کرو اور خاص تقریبوں یا جلسوں کے موقع پر چند گرم گرم جملے فرما دیا کرو۔ یا چند محیر العقول نظریوں کا ببانگِ دہل اعلان کر کے عقولِ انسانی کو حیرت میں مبتلا کر دو۔ یا کوئی ایسی تحریک پیش کر دو جس کا عملی ثبوت دینے کی نوبت ہی نہ آئے۔ یاد رکھیئے غریب ہندوستان کی قیادت آسان نہیں۔ یہ کاشتکاروں کا ملک ہے۔ یہاں قومی خدمتگاروں کو کاشتکارانہ زندگی بسر کرنی ہوگی۔ ہیٹ کی جگہ سر پر گھاس کا گٹھر رکھنا ہوگا۔ موٹر کی جگہ بیل گاڑی کے جاں گسل ہچکولے کھانے پڑیں گے۔ نکٹائی کی جگہ بیلوں کی رسّیوں کو گردن سے باندھنا پڑے گا۔ فرمائیے تیار ہیں آپ اس ضبطِ نفس کے لئے، کیا مستعد ہیں آپ اس ایثار کے لئے ـــ اگر نہیں تو یاد رکھیئے آپ ہندوستانیوں کی قیادت کے اہل نہیں ہیں۔ بدوؤں میں اسلام کی اشاعت کے لئے بدوؤں میں رہ کر اُن میں مل جل کر زندگی بسر کرنی ہوگی۔ بادشاہ ہوتے ہوئے گدایانہ زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی۔ مفوّضہ خدمت کی عدمِ تکمیل کی صورت میں اگر عامل اپنی شدتِ گرسنگی کا اعتذار پیش کرتے ہوئے کُرتے کا دامن اٹھا کر پیٹ سے بندھی ہوئی ایک اینٹ دکھلائے گا تو آپ کو بادشاہ ہوتے ہوئے اپنے فقر اور ایثارِ نفسی کے ثبوت میں اُسی وقت کُرتے کا دامن اُٹھا کر پیٹ سے بندھی ہوئی دو اینٹیں دکھانی ہوں گی۔ غالباً آپ سمجھ گئے ہوں کہ میں تمثیلاً کیا کہہ رہا ہوں ـــ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مصلح بننے سے پہلے اپنی اصلاح

کرنی پڑے گی۔ فرمائیے خدا کے لئے فرمائیے آپ اپنی اصلاح سے فارغ ہو چکے۔ آپ نے اپنے لواحقین کی اصلاح بھی فرمائی۔ مَیں آپ کی سمع خراشی کی جسارت نہ کرتا اگر آپ نے اپنی نام نہاد لیڈری کی دھونس نہ دی ہوتی۔ مَیں معافی چاہتا ہوں اگر کوئی بات ناگوارِ خاطر ہوئی ہو۔ جمیل سب کچھ سنتا رہا۔ اور سُننے کے بعد اُٹھ کر چل دیا۔ شاہد دُور تک ساتھ گیا لیکن جمیل کو واپس لانے میں کامیاب نہ ہوا۔

شاہد نے راما کی تلاش میں شہر کے تمام گلی کوچوں کی خاک چھان ڈالی مگر بے سُود۔ مایوس ہو کر واپس آ رہا تھا کہ راستہ میں اُسے ایک رکشا والا ملا۔ شاہد نے رکشا دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ تو راما کا رکشا ہے۔ لیکن رکشا والا بوڑھے راما کی جگہ ایک نوجوان ہے۔ اُس نے رکشا والے سے پوچھا۔ "راما کہاں ہے یہ رکشا تو راما کا ہے!" "جناب یہ رکشا کبھی راما چلایا کرتا تھا لیکن اب مَیں چلاتا ہوں مالک نے راما کو نوکری سے الگ کر دیا ہے اور اُس کی جگہ مجھے رکھ لیا ہے۔" رکشا والے نے کہا۔ "راما نوکری سے نکال دیا گیا ہے؟ اب وہ کیا کرتا ہے۔ تم مجھے اُس کا پتہ بتا سکتے ہو؟" شاہد نے سوال کیا۔ "جناب مَیں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ وہ اب کیا کرتا ہے۔ مگر یہ کھُلی ہوئی بات ہے کہ بھیک مانگنے کے سوا وہ غریب اب کر بھی کیا سکتا ہے۔ اب اُس سے کوئی بھی کام نہیں ہو سکتا۔ اور اُسے نوکری سے الگ بھی اسی لئے کیا گیا ہے کہ وہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کہاں رہتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں۔" رکشا والے نے جواب دیا۔

شاہد شہر کے ہر اُس حصّہ میں جہاں بے خانماں فقیر اُٹھتے بیٹھتے ہیں پھرا

مگر راما کا کہیں سُراغ نہ ملا۔ وہ اسی اُدھیڑبن میں مکان کی طرف جارہا تھا کہ اُس کے
پاس ہی ایک برق رفتار موٹر آکر رُکی۔ اس نے مُڑ کر دیکھا تو مسز خان رو برو ہیں۔
"ہیلو شاہد اتنے منہمک ہو کر آپ چلتے ہیں کہ ہارن کی صدا سے بھی نہیں چونکتے۔
آیئے موٹر پر تشریف رکھیئے میں آپ کے دولت خانہ پر ہی حاضر ہونے کی نیت سے
نکلی تھی۔" مسز خان نے کہا —— موٹر پر سوار ہونے کے بعد مسز خان نے اپنی
فیلو لیڈی سے تعارف کرایا "آپ مس فاروقی ہیں۔ میری ہم جماعت ہیں۔ اسٹوڈنٹ
ایسوسی ایشن کی سرگرم کارکن ہیں، بے پناہ نقاد ہیں۔"

شاہد نے بے خیالی کے عالم میں جواب دیا۔ "میں آپ دونوں سے مل کر
بہت مسرور ہوا۔" —— مسز خان نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "مسٹر
شاہد شاید آپ اس حقیقت سے بے خبر نہ ہوں گے کہ مسٹر جمیل کا لاثانی و لافانی
شاہکار "تصویرِ افلاس" جو گزشتہ ہفتہ "السٹر بینڈ ویکلی" کے اڈیشن میں شائع ہوا تھا
باتفاق رائے دورِ حاضر کا افضل مزین کارنامہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ تمام موقر و وقیع صحائف
کے فاضل مدیروں نے اس تصویر کو دنیائے مصوری میں ایک گرانقدر اضافہ تسلیم
کیا ہے —— آپ جانتے ہیں میں شہر کے تمام اعلیٰ طبقہ کی سوسائیٹیوں میں شریک
ہوتی ہوں۔ غالباً ہر طبقہ میں اس تصویر کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ ہمیں
فخر کرنا چاہیئے۔ کہ ہمارے احباب میں مسٹر جمیل جیسی ہستی بھی ہے۔ مسٹر جمیل کی اس
شاندار کامیابی کی یادگار منانے کے لئے ہم آئندہ اتوار کو ایک عظیم الشان جلسہ
منعقد کرنا چاہتے ہیں۔ اس جلسہ میں مسٹر جمیل کے کارہائے نمایاں پر ایک تفصیلی
روشنی ڈالی جائے گی۔ ہم نے جلسہ کے انعقاد کے لئے ٹاؤن ہال استعمال کرنے کی

اجازت حاصل کر لی ہے ۔ ارادہ ہے کہ شہر کے تمام معزز و مقتدر حضرات کو مدعو کیا جائے مسٹر جمیل کی خدمت میں ایک گولڈن واچ پیش کرنا چاہتے ہیں ۔ اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک ہزار روپیہ کی ضرورت ہے ۔ اب تک صرف تین سو روپئے جمع ہوئے ہیں ۔ امید ہے کہ آج شام تک پانچ سو روپئے جمع ہو جائیں گے ۔ میں اس جلسہ کی کنوینر ہوں ۔ مسٹر وہائٹ اس کی صدارت فرمائیں گے ۔ اگر آپ قبول فرمائیں تو مجلسِ استقبالیہ کی صدارت کے لئے آپ کا نام پیش کر دوں ۔ مسٹر جمیل آپ کے گہرے دوست ہیں ۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ ایک ایسے کام میں جس سے آپ کے دوست کی حوصلہ افزائی مقصود ہو اور ایسے جلسہ میں جو آپ کے دوست کی شہرتِ عام اور بقائے دوام کا ضامن ہو آپ جی کھول کر حصّہ نہ لیں ۔

شاہد نے بسورتے ہوئے کہا " میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں ۔ فی الحال یہ حقیر رقم حاضر ہے ۔ رہا مجلسِ استقبالیہ کی صدارت کا سوال تو شاید آپ سے پوشیدہ نہیں کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں "۔

شاہد کا گھر قریب آگیا تھا اور وہ بڑی معذرت خواہی کے بعد موٹر سے اتر کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا ۔ وہ ایک گہرے سکوت میں کھویا ہوا تھا ـــــ باوجود تلاش رآما کا نہ ملنا ۔ ایک فضول سی بات کے لئے مسز غان کا دردِ سری مول لینا یہ تھے وہ موضوعات جن پر وہ دل ہی دل میں نقد و نظر کر رہا تھا ۔ " افلاس کی تصویر " اور عظیم الشان کارنامہ ـــــ جمیل اور دنیا کا بہترین مصوّر اور مصلحِ قوم ۔ کیا ہو گیا ہے آخر اس دنیا اور اس پر رہنے والوں کو ـــــ ہاں ٹھیک ہے جمیل کے اس دعوے کو کہ شہر کی تمام نئی روشنی کی خواتین اس دام غلام ہیں ، میں غلط سمجھا کرتا تھا لیکن شاید . . . . . ایک جلسہ ـــــ اور صرف

اس غرض سے کہ حدیثِ دوست دہرائی جائے۔ چندہ اور ایک ہزار ـــــ دوست کی تحسین اس صلہ میں کہ اس نے افلاس کی تصویر کھینچی ہے۔ افلاس کا مظاہرہ کیا ہے۔ افلاس کا علاج نہیں ـــ درد کی دوا نہیں ۔۔۔ دوا کی بیچارگی ـــ رِستے ہوئے ناسور کی رُسوائی ـــ ناسور پر پھاہا نہیں ـــ بلکہ اس کا گھناؤنا مظاہرہ ـــ اُف ہندوستان ـ غریب ہندوستان ـ عجیب ہندوستان ـ غلام ہندوستان ـــ پُراسرار ہندوستان ـــ گھناؤنے ناسور کی تصویر کشی ـــ اور مصور کی شان میں قصیدہ ـــ قصیدہ اور ہزاروں کی قیمت پر ۔۔۔ جس کی تصویر بنائی گئی ہے وہ ردی کے ٹکڑوں کے لئے ترسے اور تصویر بنانے والے کو بانس پر چڑھانے کے لئے ہزاروں روپئے خرچ کر دیئے جائیں۔

سردی کا موسم ہے ۔ اتوار کی رات کے نو بجے ہیں۔ ٹاؤن ہال زرق برق لباس والوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ برآمدے میں لاتعداد برق رفتار موٹریں کھڑی ہوئی ہیں فٹنوں کا تانتا بندھا ہوا ہے ۔ ہال بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ مسٹر جمیل صدر کی دائیں جانب اور مسز خان بائیں طرف فروکش ہیں ۔شاہد دُور سے سامنے والی تصویر "تصویرِ افلاس" کو گھور رہا ہے ـــ یہ ایک بوڑھے رکشا والے کی تصویر ہے ـــ رکشا کی تصویر بوقلموں اور رکشا والے کی بدرنگ ہے۔ ہال داد و تحسین کے نعروں سے گونج رہا ہے۔ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی ـــ صدر تقریر فرمارہے ہیں "مسٹر جمیل اپنی مابہ الامتیاز خصوصیات کی بِنا پر کسی مزید تعارف کے محتاج نہیں ۔ آپ ایک دردمند مصلح قوم ۔ ایک چابک دست مصور اور ایک بے پناہ مقرر ہیں ۔ یوں تو آپ کا ہر کارنامہ نادرۂ روزگار ہونے کا درجہ رکھتا ہے ۔ مگر موجودہ شاہکار جس کے لئے آج ہم سب لوگ مسٹر جمیل کو داد دینے کے لئے

حاضر ہوئے ہیں دورِ حاضر کا اتنا عظیم بالشان کارنامہ ہے جس پر ہماری تہذیب، ہمارا آرٹ اور ہمارا کلچر ہمیشہ فخر کریں گے۔ ہمیں ممنون ہونا چاہیئے مسٹر خان کا جنھوں نے ہم سب کو یہاں جمع کر کے مسٹر جمیل کے فضائل و شمائل پر لب کشائی کا موقع عطا فرمایا۔ ——— جو تصویر سامنے آویزاں ہے اُس کے ہر خط میں دُنیائے معنی پوشیدہ ہے ——— وہ مکمل تصویر ہے ہندوستان کے اُس افلاس کی جس کا شکار اس غریب مُلک کا ہر فرد ہے - - - یہ تصویر ہمیں بتائے گی کہ جذباتِ ہمدردی۔ رحمدلی اور فیاضی کے کیا معنی ہیں۔ اس کے دیکھنے سے ہمارے قلوب میں ایثار و خلوص کا وہ جذبہ پیدا ہوگا جو نہال کر دے گا ہمارے غریب بھائیوں کو ——— ہال تالیوں سے گونج رہا تھا ——— ہیر ہیر کے نعروں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔

ٹھیک اسی وقت ایک ضعیف و ناتواں بھکاری اپنے بچے کو سینے سے چمٹائے ہوئے ٹاؤن ہال کی طرف آیا۔ سردی سے اس کا جسم تھرتھرا رہا تھا۔ وہ آرام کرنا چاہتا تھا۔ آج اس کی آرام گاہ اس کی آرام گاہ نہ تھی ——— بلکہ وہاں بڑے آدمیوں اور مالک لوگوں کے جوتے پڑے ہوئے تھے۔ وہ موٹروں کے ٹھٹ دیکھ کر سہم گیا ——— ہال کی روشنی سے اُس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ بڑے آدمیوں کی گرجدار آوازوں سے وہ لرز اُٹھا۔ اور اس خیال سے کہ آج وہ ہال کے برآمدہ میں نہ سو سکے گا اُس کا سر چکرانے لگا۔ سردی اور جنوری کی سردی۔ پناہ بخدا۔ وہ گیٹ کی طرف گیا ——— ایک جگہ اُس نے اپنی دریدہ چادر بچھا دی۔ اُس پر بچے کو لٹا دیا اور بچے کے قریب ہی خود بھی لیٹ گیا۔ کروٹیں بدلتا رہا ——— سردی بڑھ رہی تھی - بڑھتی جارہی تھی۔ بچہ سکڑا جا رہا تھا۔ بوڑھے نے اُسے

سینے سے چمٹا لیا ــ ایک بجے جلسہ برخاست ہو گیا۔ شورشِ کائنات فرو ہوئی۔ تحسین و تعریف کے سمع خراش نعرے سکون پذیر ہو گئے۔ موٹروں کے اسٹارٹ ہونے کے شور نے کانوں کے پردے پھاڑنے شروع کئے ــ ہال سے سب کے اخیر میں مسٹر جمیل اور مسز خان برآمد ہوئیں ــ مسٹر جمیل کی گولڈن واچ اپنی بہار دکھا رہی تھی۔ گردن پھولوں کے ہاروں کے بوجھ سے جھکی پڑتی تھی ــ شاہد حسب معمول خموش تھا۔ اس تمام ہنگامہ میں بھی ایک شخص کبیدہ خاطر نظر آ رہا تھا۔ گیٹ کے پاس لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ کسی نے کہا "آہ غریب بھکاری ــ مر گیا بیچارہ ــ ٹھٹھر گیا یہ تو ــ ارے بچہ بھی ہے ــ سینے سے چمٹا ہوا۔ کسی کے پاس ٹارچ بھی ہے۔ شاہد لپکا ہوا گیٹ کے پاس گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ اُس کے سینہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی ــ ہائے راما۔ اُف غریب رکشا والا ــ مسز خان کی موٹر سے ہارن کی صدا بلند ہوئی ــ ایک آواز آئی "ارے بھائی شاہد ڈیڑھ بج چکا ہے۔ عجیب انسان ہیں آپ بھی۔ آخر ماجرا کیا ہے۔ مسز خان لپکی ہوئی مجمع کے پاس گئیں۔ ٹارچ کی روشنی میں نعش کو دیکھ کر "اوئی اللہ" کر کے پیچھے ہٹ گئیں ــ چلو بھی شاہد کوئی بھکاری ہے ــ روز کوئی نہ کوئی مرتا ہی رہتا ہے۔" مسز خان نے کہا ــ ایک آواز آئی "چلو بھی صبح دیکھا جائے گا" ــ دوسرے نے کہا "یار نہ کم از کم برآمدہ تک تو نعش کو پہنچا دو" ــ تیسرے نے کہا "چندہ کر کے کریا کرم کر دو۔"

شاہد نے دیوانہ وار انداز میں کہا "نہیں اس کی تجہیز و تکفین کی ضرورت نہیں یہ تمہاری ظاہری نمود و نمائش سے بے نیاز ہو چکا۔ اب اُسے تمہارے کریا کرم کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ جس شخص کو زندگی میں تن ڈھکنے کے لئے کپڑا میسر نہ آیا ہو اُسے مرنے کے

بعد کفن پہنانے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ یہ یہیں پڑا رہے گا۔ اور اس کے گوشت و پوست سے بھوکے گدھ اپنا پیٹ بھریں گے۔ اُف بے رحم دنیا ــــ اندھی دُنیا۔ مسز خان تم جانتی ہو یہ کون ہے؟ (فقیر کے منھ پر ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے) ــــ دیکھو ــــ غور سے دیکھو یہ وہی رکشا والا ہے جس کی تصویر بنا کر جمیل نے شہرت حاصل کی ــــــــ یہ وہی رکشا والا ہے جس کی غریبی کا آج جی کھول کر مذاق اُڑایا گیا ہے ــــ دیکھو ذرا قریب آکر دیکھو۔ یہ وہی ہے ــــ یہ پہلے رکشا چلاتا تھا ــــ ناتواں ہونے پر بھیک مانگنے لگا اور آج یہ تمام مصائب سے آزاد ہو گیا۔ ہاں آزاد ہے یہ ــــ مگر۔ آہ۔ تمہارے دوست کو اعزاز بخشا جا چکا ــــ اس اعزازی تقریب میں ہزاروں رُپئے خرچ کر دیئے گئے ــــ آپ لوگ نقلی تصویر کا ذلیل ترین رُخ دیکھ کر خوش ہو چکے ــــ اب اصلی تصویر کا روشن رُخ دیکھو ــــ دیکھو یہ تصویر یہ افلاس کی مکمّل تصویر تمہارے مسٹر جمیل والی تصویر سے کتنی زیادہ حسین ہے ــــ کتنی جاذبِ نظر ہے ــــ دیکھو غور سے دیکھو یہ ہے اصل تصویر افلاس کی ــــ فلاکت زدگی کی۔ ہندوستان کے غلام کی ــــ دیکھو مسز خان غور سے دیکھو۔"

معائنہ
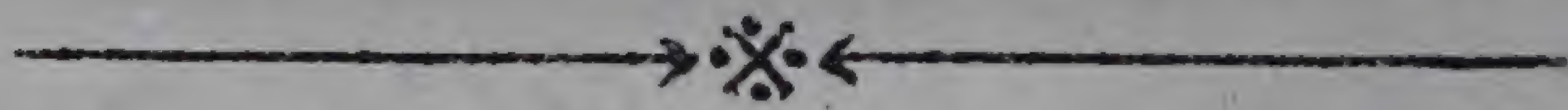
یتیم خانے کی قسمت جاگ اُٹھی تھی - دیواروں پر سفیدی اور میزوں اور کرسیوں پر رنگ ہو رہا تھا - پاخانوں کے ہنڈے بدلے جا رہے تھے - پُرانی دریوں کو چھپا چھپا کر رکھا جا رہا تھا - اور اُن کی جگہ نئی دریاں نکالی جا رہی تھیں —— یتیم خانے کا ہر فرد ہر گھڑی صفائی میں مصروف دیکھا جاتا - بہی کھاتوں، رسید بکوں اور مسلوں کی جانچ پڑتال ہو رہی تھی — یتیموں کے لئے نئے جوڑے تیار ہو رہے تھے - یتیم بچّے بھی چونچال نظر آنے لگے تھے - اس لئے نہیں کہ اب انھیں پہلے سے اچھا کھانا ملتا تھا بلکہ شاید اس خیال سے کہ اُنھیں نئے نئے جوڑے ملیں گے اور اس طرح اُن چیتھڑوں سے نجات مل جائے گی جو جگہ جگہ سے پیوند گیر ہونے کے ساتھ ساتھ بے شمار جُوؤں کی پرورش کر رہے تھے - مہتمم صاحب ہر وقت گھبرائے گھبرائے پھرتے - کبھی درزیوں کو کام جلد ختم کرنے کی فہمایش ہوتی اور کبھی سفیدی کرنے والوں پر برس پڑتے —— یتیموں پر البتہ آج کل نظرِ عنایت تھی وہ ہر وقت

کی گھڑکیوں اور گالیوں سے آج کل محفوظ تھے ۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے "ماسٹر صاحب معائنہ کے دِن قریب ہیں ۔ لڑکوں کو نظمیں بہت جلد یاد کرا دیجئے اور دیکھئے لڑکیوں کو بھی علم الحساب کے مبادیات سکھا دیجئے ممکن ہے صاحب بہادر اُن سے بھی زبانی سوالات پوچھ لیں ۔" میں نے جواب دیا "آپ اطمینان رکھیں انشاء اللہ سب کچھ حسب دلخواہ ہو جائے گا ۔" "مجھے آپ سے یہی امید ہے" مہتمم صاحب نے شفقت سے فرمایا "آئی ۔سی ۔ایس لوگ بیحد نفاست پسند ہوتے ہیں ۔ ڈسپلن کا تو خاص طور پر لحاظ رکھتے ہیں ۔آپ نے دیکھا نہیں پچھلے معائنہ کے موقع پر میکنزی صاحب نے لڑکوں کی جسمانی صحت اور صفائی کے متعلق کتنا زور دیا تھا ۔ اِن لوگوں کو خوش رکھنا ہی پڑتا ہے اور دراصل یتیم خانہ جیسے ادارے کا کام حکامِ وقت کو خوش رکھے بغیر چل ہی نہیں سکتا ۔ پھر ہمارے یتیم خانہ کے احیا و بقا کا راز اہلِ خیر کی توجہ میں ہی مضمر ہے ۔ اگر حکام وقت ہمارے انتظامی معاملات کے متعلق بُرا ریمارک دیں تو ہمیں چندہ کون دے گا ۔ آپ کو شاید نہیں معلوم کہ میرے زمانہ میں ہمارے یتیم خانہ نے کتنی ترقی کی ہے ۔ والد مرحوم کے زمانہ میں صرف ۳ لڑکے تھے اور خدا کے فضل سے اب ۳۰ لڑکے اور ۱۵ لڑکیاں ہیں ۔ مجھ سے پہلے نہ تو بچوں کی تعلیم کا انتظام تھا اور نہ صنعت و حرفت کا شعبہ ہی ۔"

میں مہتمم صاحب کی ہر بات کا جواب 'جی ہاں ۔ بجا ارشاد' سے دیتا رہا میں اتنا بے وقوف نہ تھا کہ حقائق پر تبصرہ کر کے اپنے خداوندِ نعمت کے قہر کا مستوجب ہوتا ۔۔۔ عام دنوں میں ہمارے یتیم خانے کے بچے یتیم خانے میں بہت کم کھاتے ۔ کہیں نہ کہیں سے دعوتیں آتی رہتیں ۔ جب کبھی کہیں سے دعوت

نہ آتی تو انھیں نان اور آش یا جو کا دلیا دیا جاتا۔ رؤسا اور اُمرا کے ماہانہ چندے کی اوسط پانچ ہزار روپیہ سے کم نہ تھی لیکن یتیم خانہ کا ماہانہ خرچ کسی حال میں ایک ہزار روپئے سے زیادہ نہ تھا۔ بچے روز صبح کو شہر سے آٹا مانگ لاتے تھے۔ مہتمم صاحب نے معائنہ کے مہینہ بھر پہلے سے حکم دے دیا تھا کہ نہ تو بچے کہیں آٹا ملنگنے جائیں اور نہ شہر والوں کی دعوتیں ہی قبول کی جائیں۔ اس میں کیا مصلحت تھی وہی بہتر جانتے ہیں۔ پہلے بچے مہینوں نہ نہلاتے تھے مگر آج کل غسل کا روزانہ انتظام کیا جاتا تھا انھیں مہتمم صاحب کے گھر کے برتنوں اور کپڑوں کے دھونے سے بھی چھٹکارا مِل گیا تھا۔ گھوڑے کی مالش کی خدمت بھی نہ انجام دینی پڑتی تھی ــ لڑکیوں پر بھی مہتمم صاحب کی عنایات کم نہ تھیں۔ اب انھیں بھی مہتمم صاحب کے گھر کا کھانا پکانے، بچوں کے کھلانے اور گو مُوت اُٹھانے سے چھٹکارا مِل گیا تھا۔

خدا خدا کر کے معائنہ کا دِن آگیا۔ صاحب بہادر اور ان کے عملہ کے علاوہ بعض عمائدینِ شہر بھی اس پارٹی میں مدعو کئے گئے تھے۔ شہر کے بعض شعرا صاحبان نے صاحب بہادر کی شان میں قصیدے کہے تھے جنھیں مہتمم صاحب نے بڑے اہتمام سے چوکھٹوں میں جڑوایا تھا۔ صاحب بہادر یتیم خانہ میں داخل ہوتے ہی گلاب کے پھول برسائے گئے۔ بچوں نے یک زبان ہو کر بلند آواز میں مبارکباد کا گیت سُنایا۔ شعرا نے اپنا اپنا قصیدہ پڑھا اور فریم شدہ قصائد صاحب بہادر کی خدمت میں پیش کر دیئے گئے۔ آنریری سکریٹری صاحب نے یتیم خانہ کی سالانہ رپورٹ انگریزی میں پڑھ کر سُنائی جس کے جواب میں صاحب بہادر نے فیاضانہ طور پر تمام اُن شکایتوں کے رفع کرنے کا وعدہ فرمایا جن کا ذکر رپورٹ میں

کیا گیا تھا۔

اس کے بعد صاحب بہادر، مہتمم صاحب کی معیت میں لڑکیوں کے حصے میں گئے جہاں لڑکیوں نے تہنیت کا گیت یک زبان ہو کر سُنایا۔

چائے نوشی کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا۔

دُوسرے روز صاحب بہادر کی طلبی پر مہتمم صاحب اُن کے بنگلے پر گئے واپسی پر کسی قدر پریشان نظر آ رہے تھے۔ میرے اصرار پر مہتمم صاحب نے فرمایا کہ صاحب جمیلہ کو اپنے خانساماں قدرت سے بیاہنا چاہتے ہیں۔ مَیں نے کہا "بڑی اچھّی بات ہے۔ جمیلہ سیانی ہو گئی ہے اور اس کی شادی جس قدر جلد ہو جائے مناسب ہے۔ چونکہ یہ شادی صاحب بہادر کے ایما سے ہو گی کوئی وجہ نہیں کہ جمیلہ شادکام ازدواجی زندگی بسر نہ کرے۔" مہتمم صاحب جواب دیئے بغیر مکان میں داخل ہو گئے ــــ مجھے مہتمم صاحب کی پریشانی کا سبب معلوم تھا۔ــــ جمیلہ حسین تھی۔ ایسی حسین جس کا خفیف سا تبسّم مغموم دِلوں کو مسرور کر دے۔ مہتمم صاحب جمیلہ کے "یزداں شکار" اور ملائک فریب تبسّم کا شکار ہو گئے تھے ــــ مگر صاحب بہادر کا حکم کون ٹال سکتا تھا۔ یتیم خانہ کا مہتمم ــــ جس کی زندگی کا مقصد ہی حکّام۔ رؤسا اور اُمرا کی رضاجوئی ہو ــــ یتیم خانوں کے مہتمموں کے اَن داتا یہی لوگ تو ہیں ــــ انھی لوگوں سے تو یتیموں کے نام پر بھیک مانگی جاتی ہے۔ اور انھی لوگوں کی دولت سے موٹریں اور جائدادیں خریدی جاتی ہیں۔

تیسرے دِن صاحب بہادر نے اپنے جمعدار کے ذریعہ مہتمم صاحب کو پھر بُلوا بھیجا۔ جمعدار نے آتے ہی مہتمم صاحب کو مبارکباد دی اور یہ خوشخبری سُنائی کہ

صاحب بہادر یتیم خانہ کے انتظام سے بے حد خوش ہیں ـــــ پھر رازدارانہ انداز میں کہا "اسے تو بنائے رکھنا مہتمم صاحب۔ بڑا راجہ آدمی ہے ـــ پکّے نمازی اور پرہیزگار ۔ بلا کے مخیّر۔ اسی لئے تو آج تک شادی نہیں کی۔ شادی کے بعد خلقِ خدا کی خدمت بوجہ احسن نہیں انجام دے سکتے۔" مہتمم صاحب نے شام کی حاضری کا وعدہ کر کے اور جمعدار کو انعام اکرام دے کر رخصت کر دیا۔

دوسرے ہی ہفتہ میں جمیلہ کی شادی ہوگئی ـــ دولھا کی ایک آنکھ چیچک سے جاتی رہی تھی ۔ رنگ پکا تھا ـــ اور خدوخال بھدّے اور بھونڈے پھر بھی صوبہ بھر کے مالک کا خانساماں تھا اور شکل وصورت کو آج کل دیکھتا بھی کون ہے۔ روپیہ ہونا چاہیئے ۔ بیٹی کے سُکھ کا تعلّق دولت سے ہے نہ کہ شکل وصورت سے اور صوبہ کے سب سے بڑے حاکم کے خانساماں کے پاس دولت کی کیا کمی۔ حُسن تو عورت کا دیکھا جاتا ہے مرد کے شکیل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

جمیلہ سلیم الطبع ، ہنس مُکھ ، راستباز اور خوش خلق لڑکی تھی اور اُمورِ خانہ داری اور کشیدہ کاری میں چاق وچوبند ـــ سیرت کے ساتھ ساتھ صورت بھی اچھی پائی تھی مگر ان باتوں کو دیکھنے والا کون تھا ـــ اگر والدین ہوتے تو وہ ان باتوں کا لحاظ رکھتے ۔ مگر آج کل کے والدین بھی اِن خرافات کو نہیں دیکھتے ۔ انھیں تو دولتمند دولھا چاہیئے ۔ دُنیا کا نظریۂ حیات ہی سرے سے بدل گیا ہے ۔ آجکل دولتمندی انسان کی سب سے بڑی صفت ہے ۔

شادی کے بعد جمیلہ کو نہ کسی نے بُلایا اور نہ وہ کبھی یتیم خانہ آئی ۔ مہتمم صاحب بھی اب اُس کی طرف سے بے فکر ہو گئے تھے۔

شادی کے کوئی گیارہ بارہ مہینہ بعد ایک روز صاحب بہادر نے مہتمم صاحب کو پھر بلا بھیجا مگر وہ علالت کے باعث نہ جا سکے اور صاحب بہادر کے بنگلہ پر حاضر ہونے کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ صاحب بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد انھوں نے فرمایا۔ "ہمارا تبادلہ ہوگیا ہے اور چونکہ قدرت اور جمیلہ میں شکر رنجی رہتی تھی ہم نے قدرت کو مجبور کر کے جمیلہ کو طلاق دلوا دی ہے آپ جمیلہ کو لے جا سکتے ہیں ہمارا موٹر ڈرائیور تم دونوں کو پہنچا دے گا۔ مہتمم صاحب کو ہمارا سلام کہیئے۔" میں نے کہا "موٹر کی ضرورت نہیں۔ میں مہتمم صاحب کے تانگہ میں بیٹھ کر آیا ہوں۔" "اچھی بات ہے۔" صاحب بہادر نے کہا اور کام میں مصروف ہو گئے۔

جمیلہ [illegible]
راستہ میں ہر چند اس سے طلاق دیئے جانے کا سبب دریافت کیا مگر وہ آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ بولی۔ یتیم خانہ آنے کے دوسرے مہینہ ہی جمیلہ ایک بچی کی ماں بن گئی اور اس طرح ایک اور یتیم کا اضافہ ہو گیا۔

ایک روز میں ایک مقامی ہوٹل میں چائے پی رہا تھا۔ میرے قریب ہی دفتر کے کچھ بابو بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ آپس میں دفتر کی باتیں کر رہے تھے۔ دفتر کے بابو لوگ بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں۔ دن بھر دفتر میں کاغذ چاٹنا اور دفتر کے بعد دفتر کی باتوں سے پیٹ بھرنا۔ باتوں باتوں میں ایک نے کہا۔ "اگر بیجر اندی صاحب ہوتے تو کسی کی ہمت نہ تھی کہ مجھے بدل دیتا۔" دوسرا بولا "لاحول ولا قوۃ کس منحوس کا نام لے لیا تم نے صبح ہی صبح دل بھر

کھانا نہ ملے گا۔" پہلے نے کہا۔ "یار شیرازی مسلمانوں کا بڑا ہمدرد تھا۔" تیسرا جھٹ سے بول پڑا۔ "بالکل غلط۔ میں تو عرصہ تک اُن کا پرسنل کلرک رہا ہوں۔ یکتا بدمعاش اور زانی تھا۔ میں نے آج تک اتنا بدمعاش حاکم دیکھا ہی نہیں۔ دکھاوے کے لئے پبلک سے بُرے اخلاق سے پیش آتا تھا۔ کبھی کبھی نماز بھی پڑھ لیتا تھا مگر درحقیقت پرلے درجہ کا عیاش تھا۔ اپنے ملازمین کی روز شادیاں کراتا اور اُن کی بیویوں کو اپنے تصرف میں لاتا۔ اسی لئے تو اُس نے شادی نہیں کی۔ تم نے نہیں سنا ایک یتیم لڑکی سے اپنے خانساماں کی شادی کرادی تھی جب تک رہا اُس لڑکی کو رکھا اور جاتے وقت خانساماں سے طلاق دلوادی۔ اب خانساماں کی پھر شادی کرادے گا۔ یہ لڑکی بجید شریف تھی۔ مجھے ان کے پرائیویٹ ملازمین سے تمام حالات معلوم ہوتے رہتے تھے اُس غریب کو ڈرا دھمکا کر اپنا کام نکالتا رہا۔"

میں چُپ چاپ اُٹھ کر چلا آیا۔۔۔ راستہ بھر یتیم خانہ مہتمم صاحب جناب بہادر اور یتیم بچے میرے دماغ میں گھومتے رہے۔

جائزہ

راسب شاعر تھا اور فطری، وہ پرائمری تعلیم ہی کے زمانہ سے شعر موزوں کرنے لگا تھا۔ مدرسہ کے آخری اوقات میں روز آدھ گھنٹہ بیت بازی کا مشغلہ رہتا، اور ہمیشہ اس فریق کا پلہ بھاری رہتا جس کی طرف راسب ہوتا اس لئے کہ بروقت، خود ساختہ شعر موزوں کر کے کسی دوسرے شاعر کے نام سے پیش کر دیتا۔

بی۔ اے تک پہونچتے پہونچتے اس کی مشق کافی بڑھ چکی تھی۔ کالج کی لٹریری سوسائٹی کے مشاعروں کا پہلا انعام ہمیشہ وہی حاصل کرتا۔ اس کی شہرت حدود کالج سے نکل کر مقامی ادبی حلقوں تک پہونچ چکی تھی اور شہر میں جو مشاعرے منعقد ہوتے ان میں بھی اس کی شرکت لازمی سمجھی جاتی تھی۔ شاعری کی روایتی نحوست اس کی تعلیم پر کسی حیثیت سے اثر انداز نہ ہو سکی۔ اس کا طالب علمی کا زمانہ قابلِ رشک حد تک تابناک تھا۔

مگر وہ کامیاب کلرک نہ بن سکا۔ ملازمت کے دس سال گذر جانے کے
بعد بھی وہ محکمہ کا کوئی امتحان نہ پاس کر سکا اس لئے کہ اُسے سفر بھتہ کا بل اور
پنشن کے کاغذات تیار کرنے کے قواعد ازبر نہ رہتے۔ جھنجھلا کر وہ کہا
کرتا "میں گورنمنٹ سرونٹ کنڈکٹ رولز[1]" اور سول اکاؤنٹ کوڈ[2] تصنیف
تو کر سکتا ہوں، لیکن ان کا زبانی یاد رکھنا میرے لئے محال ہے"۔

عمر کے ساتھ ساتھ بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ بیوی کہتی محکمہ کے امتحانات
پاس کر لو تاکہ تنخواہ میں ترقی اور گزران میں آسانی ہو سکے۔ وہ سب کچھ خوشی سے سن لیتا
دفتر، مکان اور ادبی مجالس، یہ تھا اُس کا روزمرہ کا پروگرام

وہ عام سطح انسانی سے بلند زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھتا۔ اس کا
خیال تھا کہ تن پروری اور تن پوشی پر ہر متنفس قادر ہے۔ اگر ایک قورمہ اور تیتر پلاؤ
نوش جان کرتا ہے تو دوسرا روٹی کے سوکھے ٹکڑوں سے اشتہا کو تسکین دے
سکتا ہے۔ ایک دیبا و حریر و کمخواب سے تن پوشی کرتا ہے تو دوسرا گزی اور گاڑھا پہن کر
زندہ رہ سکتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ جس سرزمین میں زندگی بسر کر رہا ہے اس کا
ہر فرد اس کی صحیح عظمت کا معترف ہو اور اس کے اٹھ جانے کے بعد بھی اُس کا نام
زندہ رہے۔ وہ کمال۔ ہٹلر۔ محمد علی۔ اور گاندھی نہ سہی۔ میر یا غالب ضرور بن سکتا
تھا اپنے فطری ذوق۔ حساس طبیعت۔ وسیع مطالعہ اور جودت طبع کے بل بوتے پر
وہ ہندوستان کے چوٹی کے شعراء کی صف میں آجانے کا آرزومند تھا۔

---

[1] Government Servants Conduct Rules

[2] Civil Account Code.

وہ متمنی تھا عالمگیر شہرت کا۔ اس نے ملک کے موقر جرائد کو اشاعت کے لئے کلام بھیجنا شروع کیا۔ بعض رسائل کا مستقل خریدار بن گیا، بعض کو خریدار بننے کے ساتھ خریدار بھی بہم پہونچائے۔ مطالعہ میں وسعت پیدا کرنے کے نہیں بلکہ رسائل کے ایڈیٹروں کو خوش کرنے کے لئے۔ وہ کلام کے ساتھ عموماً جواب کے لئے لفافہ بھی ملفوف کرتا۔ رسالے تو آجاتے مگر کسی رسالہ میں اس کا کلام اور اس کے خطوط کا جواب نہ آتا۔ وہ ایڈیٹروں کی بے نیازی اور کج خلقی سے بلک اٹھتا۔ وہ سوچتا کیا واقعی اس کا کلام شاعری کے موجودہ معیار سے پست ہے۔ پھر مقامی مشاعروں میں اسے کیوں بے تحاشا داد ملتی ہے۔ کیا ان مشاعروں میں شرکت کرنے والے شاعری کے موجودہ رجحان سے باخبر نہیں۔ وہ روز ایک نئی نظم لکھتا اور پورے زور کے ساتھ۔

اسے دفتر کے کاموں سے اتنی فرصت نہ تھی کہ دہلی۔ لاہور۔ یا لکھنؤ پہونچکر رسائل کے ایڈیٹروں سے دوستانہ مراسم قائم کرے۔ اور نہ اتنی وسعت کہ ان کی خدمت میں تحائف پیش کرتا۔ ہاں وہ ان کی شان میں قصیدے لکھ سکتا تھا بشرطیکہ وہ انھیں چھاپ دیتے۔

جب وہ اخبارات میں کسی آل انڈیا مشاعرہ کا اعلان پڑھتا اور اس مشاعرہ میں مدعو ہونے والے شعرا کی فہرست دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا۔ وہ کہتا یہ طفیلی اور عطائی صاحب کب سے شاعر ہو گئے، رہے حضرت النقلابی اور مجددی، سو ان کی شاعری کی چول کبھی کی ڈھیلی ہو چکی ہے۔ انھیں تو اب ریٹائر ہو جانا چاہیئے۔

وہ دوسروں کے نام سے مشاعرہ کے سکریٹری اور جنرل سکریٹری کو خط لکھتا اور جی کھول کر اپنا پروپیگنڈہ کرتا مگر اکثر اس کے خطوط کا جواب نہ ملتا اور اگر کہیں سے جواب آتا بھی تو اس میں بجٹ میں گنجائش نہ ہونے کا عذر یا صرف تھرڈ کلاس کے مصارف پیش کرنے کا وعدہ ہوتا اور وہ بھی اکثر راہب کو اپنی جیب ہی سے برداشت کرنے پڑتے اس لئے کہ مشاعرہ کے اختتام پر یا تو جنرل سکریٹری صاحب کو بخار چڑھ جاتا یا وہ کسی ضروری کام سے کہیں اور چلے جاتے راہب ان مشاعروں میں بری طرح ناکامیاب ہوتا۔ بعض اوقات اس کے دوسرے شعر پر ہی تالیاں پٹ جاتیں صرف اس لئے کہ وہ ٹھیٹ تحت اللفظ میں پڑھتا مشاعروں میں سامعین سامعہ خراش آواز سننے کے لئے ٹکٹ تھوڑے سے خریدتے ہیں وہ تو محض ترنم اور ترنت سے لطف اندوز ہونے یا بالفاظ دیگر ٹکٹ کے پیسے وصول کرنے آتے ہیں۔

ایک دفعہ مقامی نیشنل وار فرنٹ کی جانب سے مشاعرہ منعقد ہوا جس میں بعض مشہور و معروف بیرونی شعرائے کرام نے بھی شرکت فرمائی۔ اس مشاعرہ میں راہب کی نظم خوب جمی۔ شہر والے اس کی صلاحیت کار سے آگاہ تھے وہ جانتے تھے کہ راہب اگرچہ اچھا پڑھ نہیں سکتا مگر شعر اچھے کہتا ہے۔ بیرونی شعراء کا کلام سن لینے کے بعد راہب کا حوصلہ بڑھ گیا تھا، وہی سٹری لمبی غزلیں جو ہر آل انڈیا مشاعرہ میں پڑھی جاتی رہی ہیں، اور اکثر ریڈیو پر سنی جا چکی ہیں، وہی بذوق ترنم،، راہب نے اپنی نظم پورے اعتماد سے سنائی، اور مشاعرہ کے بعد شعراء کے سوا ہر شخص راہب کا دم بھر رہا تھا۔

مشاعرہ کے ٹھیک دس دن بعد راہب کو دفتر میں بیس روپیہ کا منی آرڈر وصول ہوا۔ سانگ پبلسٹی آرگنائزر دہلی کی جانب سے اس کی نظم کے معاوضہ میں۔ اس نے یکے بعد دیگرے سیکڑوں جنگی نظمیں لکھ ڈالیں اور ہر نظم پر معقول معاوضہ ملتا رہا۔ اس نے اس کا ذکر گھر پر نہ کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد راہب کے پاس کافی سرمایہ تھا۔

اس کا مجموعہ کلام منظر عام پر آیا اور بڑی آب و تاب کے ساتھ۔ اس میں راہب کا خود نوشت ۵۰ صفحہ کا مقدمہ شہر کے معروف ایم ہیبل کے نام سے شامل تھا۔ یہ اندازہ لگانا کہ مقدمہ اور راہب کے کلام میں کون کس پر مرجح ہے ذرا مشکل کام تھا۔ اب رسائل کے تبصرات کا مرحلہ باقی تھا۔ ابھی کافی رقم بچ رہی تھی اس میں بعض مدیران رسائل کا بھی حصہ لگایا گیا۔ اب کیا تھا ہر طرف سے داد و تحسین کی پوچھار تھی۔ سالنامہ نکالنے والوں کے خطوط کا تانتا لگ گیا۔ کوئی لکھتا سالنامہ قریب آ رہا ہے صرف آنجناب کی نظم کا انتظار ہے۔ کوئی لکھتا سالنامہ کے سرورق کی زینت کے لئے تصویر ضرور بھیج دیں۔ راہب اپنے تمام خطوط کو ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیتا۔ دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں، دو سال کے اندر اندر دس مجموعے بازار میں آ گئے اور ہر مجموعہ کے کئی کئی ایڈیشن چھپے جس رسالہ میں دیکھو راہب کی شاعری کے محاسن پر عجیب عجیب انداز سے نظر ڈالی جا رہی ہے۔ راہب حکیم مشرق مفکر اعظم، مجتہد العصر وغیرہ وغیرہ۔ بھی کچھ بن چکا تھا۔

اب وہ آل انڈیا مشاعروں کے دعوت ناموں کے جواب میں سیکنڈ کلاس کے کرایہ کے علاوہ ایک ایک ہزار روپیہ فیس کا مطالبہ کرتا۔ اور یہ مطالبہ

شاذونادر ہی رد ہوتا۔ وہ اس پر بھی مطمئن نہ تھا۔

اُس کے پاس بنگلہ۔ موٹر۔ نوکر۔ ریڈیو۔ آیہ۔ خانساماں۔ مالی۔ باغیچہ سبھی کچھ ہے۔ مگر اگر نہیں ہے تو وہ "پہلا سا الفکر"، وہ شعر کہتا ہے، مگر صرف کہنے کے لئے، وہ ایک مجلّہ ماہنامہ کا بھی مالک ہے جس کا ایک مستقل عنوان ہے "جائزہ"۔ اس میں وہ مُلک کے نامور شعرا کے کلام کے معائب کو اُچھالتا ہے، اور اس غرض سے کہ رہے نام سائیں کا۔

گھروندہ

مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ زینت کے
ذکر پر میری آنکھوں میں غیر معمولی چمک رونما ہو جاتی۔ چہرہ کسی خاص جذبہ کے
تحت تمتما اٹھتا۔ زبان میں لکنت اور حواس میں اختلال پیدا ہو جاتا۔ پوچھنے
کو تو اس کا حال پوچھ بیٹھتا لیکن بتانے والا کیا کہہ رہا ہے اس کی مجھے مطلق خبر
نہ ہوتی۔ میری نگاہوں میں اس کے شاداب و شگفتہ۔ متین و سنجیدہ اور خوددار
چہرے کے نقوش پھرنے لگتے۔ اس کا وہ ہر معاملہ میں حکم بن جانا، وہ ہر بات
میں فلسفیانہ استدلال۔ ایک واقعہ تو میرے دل و دماغ پر مرتسم ہو کر رہ گیا تھا
ایک روز گاؤں کے بچے شوالہ میں کھیل رہے تھے (شوالہ ہمارے گاؤں کی ایک
برساتی ندی کا نام ہے۔ وجہ تسمیہ معلوم نہیں) کوئی گڑھوں سے چلوے پکڑ رہا تھا،
کوئی چکنے اور سڈول پتھر یاں جمع کر رہا تھا۔ کوئی گھروندا بنانے میں ہمہ تن مصروف
تھا۔ زینت نے حکم دیا کہ شوالہ کے دھارے کا رُخ بدل دیا جائے۔ بچے بل پڑے
پہلے تو مٹی کا ایک بند قائم کر کے انھوں نے پانی روک دیا اور پھر پانی کا راستہ
دوسری جانب کر دیا۔ دھارا دوسری جگہ سے بہنے لگا۔ زینت بڑی خوش تھی جب
میں حسب معمول اُسے کھانے کے وقت ڈھونڈتا ہوا شوالہ پر پہنچا، وہ فاتحانہ
انداز میں اپنے ساتھیوں سے کہہ رہی تھی "تم نے دیکھا مل جل کر کام کرنے میں
یہ طاقت ہے اگر ہم اسی طرح ہر کام مل جل کر کریں تو ہماری زندگی کے دھارے
کا رُخ بدل سکتا ہے اور ہمارا گاؤں اچھی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ میں اس
فلاسفر کو پکڑ لایا ــــــ دوسرے دن زور کی بارش ہو گئی۔ شوالہ میں زیادہ
پانی آجانے سے بچوں کا بنایا ہوا دھارا بڑے دھارے میں مدغم ہو گیا اور

پانی کم ہونے پر دھارا نے اپنا اصلی رخ اختیار کر لیا۔ میں جو تھے دور جب زینت
کو ڈھونڈتا ہوا پتوار پہونچا تو وہ ایک درخت [illegible] دیکھ رہی تھی۔ خیال
میں مستغرق اور ہزیمت خوردگی کے احساس سے نڈھال۔ میرے اصرار پر اس نے
بتایا کہ وہ سوچ رہی تھی کہ میں جول کی برکت سے دھارے کا رخ بدلا تو جا سکتا
ہے مگر صرف تھوڑے عرصے کے لئے دھارے کا رخ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بدلنے
کے لئے سخت محنت درکار ہے۔ ہمیں بہت دور سے اور شاید جہاں پتوار کھوتا
ہے وہاں سے اس جگہ تک زمین کو کھودنا پڑے گا جہاں یہ اتر جا کر گرتی ہے۔"
تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد کہنے لگی۔
" اسی طرح گاؤں کی حالت سدھارنے کے لئے ہمیں شروع سے تمام برائیوں
کو دور کرنا ہوگا۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ، اور گاؤں والوں کی عادتیں بدلنی ہونگی

میں جب اسکول کے کاموں سے فارغ ہوتا اور تنہائی میں میرے خیالات
گاؤں پہونچ جاتے اور میری باطنی آنکھیں دیکھتیں کہ زینت پتوار کے پاس کھڑی
ہوئی بچوں کو دھارے کا رخ بدل دینے کا حکم سنا رہی ہے۔

میری تیاری بے معاو نہ تھی۔ یہ معاوضہ انٹرنس اور پھر بی اے کا امتحان دے
دینے کے بعد ختم ہو جانے والی تھی۔ جب میں فورتھ ایر میں تھا۔ ایک دن چچا کا خط
آیا۔ یہ میرے نام ان کا پہلا خط تھا۔ وہ عموماً ماموں سے خط و کتابت کرتے اور
انھیں کے خطوط کے ذریعہ میری خیریت دریافت کر لیتے ہیں بچپن میں یتیم ہو گیا

تھا اور میری پرورش چچا نے کی تھی۔ میں نے والدین کو نہ دیکھا تھا اور اگر دیکھا بھی تھا تو اب اُن کی صورت میرے ذہن میں محفوظ نہ تھی۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ چچا کا خط مجھے ملا، اُنھوں نے لکھا تھا:۔

زینت نے پرائیویٹ طور پر ادیب فاضل اور پھر انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا ہے۔ آج کل ایف اے کی طیاری کر رہی ہے ماشاء اللہ سیانی ہوگئی ہے۔ ارادہ تھا کہ امسال تم دونوں کے فرض سے سبکدوش ہو جاتا۔ مگر زینت کی سہیلیوں سے معلوم ہوا کہ وہ شادی ہی نہیں کرنا چاہتی۔ تم جانتے ہو یہ کام عورتوں کے ہیں اگر تمہاری چچی زندہ ہوتیں تو کوئی بات ہی نہ تھی۔ میں زینت کی دل شکنی کسی حال میں مناسب نہیں سمجھتا۔ اُس نے گھر پر اسکول قائم کر رکھا ہے۔ گاؤں کی تمام بچیوں کو خود تعلیم دیتی ہے اس کا قصد پرائیویٹ بی اے کرنے کا ہے، بی۔ اے کے بعد وہ مُلک اور قوم کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ ہر وقت مطالعۂ کتب اور تعلیم و تعلم میں منہمک رہتی ہے۔ گاؤں کی عورتوں اور گھر والوں سے بھی دُور دُور رہتی ہے۔ مزاج میں بے حد خشونت پیدا ہو گئی ہے انگریزی تعلیم کا اثر کہو یا مطالعہ کا ذوق اُسے انسانوں سے اور بالخصوص مردوں سے نفرت ہے۔ ایک روز باتوں باتوں میں اپنی ایک سہیلی سے کہنے لگی: "میں خدمتِ وطن کو ہر فرض پر مرجح سمجھتی ہوں حصول تعلیم سے میرا مقصد خدمتِ وطن کی اہلیت پیدا کرنا ہے بی۔ اے

کے بعد میں باقاعدہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر آجاؤں گی" پہیلی گوا
سوال یہ کہ دوسرے کی امانت ہو جانے کے بعد خدمتِ وطن نا ممکن
ہے۔ اس نے کہا "میں شادی کرنے کی حماقت ہی کیوں کرنے لگی"۔

اس خط سے میری نگاہوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ زینت کے بغیر میں کیونکر زندہ رہ
سکوں گا، نہیں وہ ایسا نہ کرے گی وہ متاہل زندگی میں بھی ملک و وطن کی خدمت
کر سکتی ہے میری طرف سے اُسے اس کی اجازت ہو گی۔

ہوش بجا ہونے پر میں نے زینت کو خط لکھا۔ زینت کے نام یہ میرا پہلا خط تھا
اسی خط میں میں نے اُسے اس کے مقاصد حیات کے ترفع پر مبارکباد دی تھی۔ اُسے
یقین دلایا تھا کہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر بھی وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکتی ہے۔

میرے خط کے جواب میں زینت نے جو کچھ لکھا بڑی حد تک جاں گسل تھا اس نے
متاہل زندگی کی مخالفت میں عجیب و غریب دلائل پیش کئے تھے۔ اس کے نزدیک
خدمتِ وطن سب سے بڑی عبادت تھی۔ اس کے خیال میں شادی ایک فضول
رسم تھی ہندوستان جیسے غریب ملک میں بچے پیدا کرنے کے معنی غلاموں
میں اضافہ کرنا تھا۔ میرے اظہار محبت کے جواب میں اس نے بتایا تھا کہ
محبت صرف عورت کا حق ہے۔ مرد نے نہ کبھی محبت کی اور نہ وہ کسی سے محبت
کر سکتا ہے وہ حصول مقصد کے شدید جذبہ کو محبت سے تعبیر کرتا ہے۔ حصول
مقصد کے بعد اس کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں اور محبت معمولات میں جذب
ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس خط نے میری آرزوؤں کی دنیا میں ہلچل ڈال دی۔ اس کے الفاظ میں زور اور دواعیات میں وزن تھا۔

پورے سات سال بعد بی۔ اے کا امتحان دے کر میں نے وطن کا رخ کیا اس تمام عرصہ میں مجھے وطن کیوں نہ جانے دیا گیا اس راز سے میں خود آگاہ نہیں ــــــــ گاؤں کے شکستہ مٹی کے مکانات سے حسن کی بارش ہو رہی تھی وطن کی خاک میں کتنا جذب ہوتا ہے "میخارِ وطن از سنبل و ریحان خوشتر" کہنے والا میری ہی طرح عرصہ تک مہجورِ وطن رہا ہوگا۔ گاؤں کی ناہموار گلیاں ناگپور کی امپیریل روڈ سے کہیں زیادہ حسین تھیں۔ گھر میں چھوٹے بڑے سب ملنے والوں کا تانتا بندھ گیا لیکن میری نظریں زینت کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ مدرسہ گئی تھی۔ اطلاع پر اس نے یہ جواب دیا کہ تھوڑی دیر میں آ رہی ہوں کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد جب میں غسل خانہ سے تبدیل لباس کے بعد نکل رہا تھا ایک مجسمہ شباب پر میری آنکھیں جم رہی تھیں سلام کے بعد مزاج پرسی پر زینت کی آنکھیں زمین پر گڑ گئیں۔ دیکھتے ہوئے گول گول چمکتی ہوئی پیشانی شرابی آنکھیں سر تا پا سفید لباس۔ حسین سفید سفید دانت قدرتی حور پر سرخ سرخ ہونٹ مہمیز کی جگہ مکمل حسن تھی۔ زینت نے میرے لئے چائے تیار کی۔ جب میں چائے پی رہا تھا کہنے لگی "شہاب بھیا آپ تو بہت دنوں میں آئے۔ ماشاء اللہ آپ کی صحت بڑی اچھی ہے۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ دوسرے کالج کے لڑکوں کی طرح طالبعلمانہ ذمہ داریوں نے آپ کو بھی گھلا دیا ہوگا آپ کا نتیجہ کب نکل رہا ہے۔ بی۔ اے کے بعد کیا کرنے کا قصد ہے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ آپ بھی انگریز بن گئے ہونگے۔ مجھے انگریزی لباس سے سخت نفرت ہے دیکھئے نہ دیسی لباس آپ کے سڈول

جسم پر کتنا بھلا معلوم ہو رہا ہے۔ شاید آپ سگرٹ اور پان کی لعنت سے بھی محفوظ ہیں۔ جب ہی آپ کے دانت چمکیلے اور خوبصورت ہیں۔

وہ میرے بال۔ پیشانی۔ آنکھ دانت اور لباس پر باری باری سے تبصرہ کر رہی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میری ہر بات میں اُسے حُسن ہی حسن نظر آیا میں نے گھبرا کر کہا " زینت تم بھی تو مکمل حور نظر آ رہی ہو" زینت کے چہرے پر سُرخی کی لہر دوڑ گئی۔ اُس نے جھینپ کر منہ پھیر لیا۔

ملاقاتیوں سے فارغ ہونے کے بعد میں زینت کے کمرہ میں چلا گیا ہر چیز سے نفاست برس رہی تھی، میں نے ہارمونیم اُٹھاتے ہوئے پوچھا " زینت تمھیں گانے سے بھی کچھ شغف ہے" اُس نے مسکرا کر کہا " ہاں مگر یوں ہی سا۔ شاید آپ اچھا گاتے ہیں" میں نے ہارمونیم زینت کو دے دیا اور مدھم سُروں میں غالب کی غزل سے

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں ؛ تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

گانے لگا۔ زینت فن کارانہ طور پر ہارمونیم نوازی میں مصروف تھی غزل کے اختتام پر بولی " شہاب بھیّا ماشاء اللہ بلا کا گلا پایا ہے اپنی عمر میں بالکل پہلی مرتبہ میں موسیقی کے اعجاز کی قائل ہوئی ہوں"

نتیجہ نکل آیا میں فرسٹ ڈویژن اور زینت ایف۔ اے میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گئی ـــــ میں بڑی حیرت سے نوٹ کر رہا تھا کہ

زینت درس و تدریس میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہی ہے۔ اس کا زیادہ وقت میری خدمت میں گذرتا۔ بارش شروع ہوگئی تھی، سبزہ اُگ آیا تھا مینڈکوں اور جھینگروں نے غل مچانا شروع کردیا تھا۔ ایک رات کو میں چوپال میں لیٹا ہوا تھا ـــــ بوندیں پڑ رہی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ چوپال سطح زمین سے بلند اور چاروں طرف سے کھلی ہوئی تھی ـــــ شہر والے ایسی پُرفضا چوپالوں کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ میں بے خودی کے عالم میں ذوق کا یہ مصرع گنگنا رہا تھا ع

"میرے منہ سے تو حرفِ آرزو مشکل سے نکلے گا"

اتنے میں زینت آگئی۔ میں نے چونک کر پوچھا "زینت اس وقت کیسے" اس نے دودھ کا پیالہ بڑھاتے ہوئے کہا "آج آپ دودھ نہیں پئیں گے" میں نے کہا "معاف کرنا بھول گیا تھا ـــــ زینت کتنا خوش رہا موسم ہے تم بھیگ تو نہیں گئیں ـــــ زینت تم میرے لئے بڑی تکلیف اٹھاتی ہو۔ مجھے بعض اوقات تم سے شرم آنے لگتی ہے ـــــ "آج چچا صبح سے نظر نہیں آئے" "آپ کو معلوم نہیں وہ دو تین دن کے لئے دادا پور گئے ہیں گھوڑا خریدنے کے لئے" زینت نے جواب دیا ـــــ یہ کہکر زینت پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میں نے گھبرا کر کہا "زینت معاف کرنا ـــــ تمہیں بڑی تکلیف ہوئی میں بھول گیا اور تم سے بیٹھ جانے کی درخواست بھی نہ کرسکا میں بڑا بدحواس ہوں۔ زینت" "اور جب تم میرے پاس ہوتی ہو تو میری بدحواسی میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ زینت نے بات کاٹ کر کہا،

آپ پونا کب جا رہے ہیں؟ "میں چلا جاؤں زینت؟" میں نے کہا میرا یہ منشا نہیں۔ ابا کہہ رہے تھے کہ آپ پونا کانگریس نگر کمیٹی کے بالمشاہرہ سکریٹری مقرر کئے گئے ہیں زینت نے کہا "ہاں زینت ——— ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ ملیں گے۔ کیا برے ہیں اس زمانہ میں اور پھر ہم خرما و ہم ثواب ملک و وطن کی خدمت بھی ہوتی رہے گی ——— آپ کی خوشنودی بھی حاصل رہیگی۔ آپ کا مقصدِ حیات ہی خدمتِ وطن ہے" میں نے کہا۔

"نہیں میں آپ کو نہیں جانے دونگی ——— آپ یہیں رہ کر وطن کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ میں بھی آپ کا ہاتھ بٹاؤں گی" زینت نے کہا۔ میں نے بات کاٹ کر کہا "یہاں رہ کر ہم کیا کر سکتے ہیں زینت زبانی باتوں سے کام نہیں چلتا"

اس تمام گفتگو کے جواب میں زینت نے میری طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر کہا "شہاب تم کتنے بلیغ مقرر ہو، تمہارے الفاظ میں کتنا وزن ہوتا ہے" "سب تمہارا کرم ہے زینت" میں نے اس کے نرم نرم ہاتھوں کو گرمجوشی سے دباتے ہوئے کہا" زینت نے اپنا تپتا ہوا چہرہ میرے سینہ پر لگا دیا۔ اس کی حسین آنکھوں سے آنسوؤں کے گرم گرم قطرے ڈھلک پڑے ——— اس نے مغلوبانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر کہا "شہاب نہ جاؤ خدا کے لئے نہ جاؤ، میں تمہیں نہ جانے دوں گی ——— شہاب کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں؟" میں نے کہا "زینت دنیا میں تم مجھے سب سے زیادہ عزیز ہو

"شہاب تم نہ جاؤ ــــــ ہمارا وطن غلام نہیں ـــ محبت کرنے کرنے والے غلام نہیں بنائے جا سکتے ۔

زینت کے قصرِ پندار کو مسمار ہوتے ہوئے دیکھ کر میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا ــــ آج اُس کے مقصدِ حیات کے بلند و بالا محل کی حیثیت اس گھروندے سے زیادہ وقیع نہ تھی ــــ جو بچّے روز بنوا ڑمیں بنایا کرتے تھے ـــــ

قیدی

میں دو گھنٹہ قبل جیل میں تھا۔ چھ ماہ کی سزائے بامشقت بھگتنے کے لئے۔ یہ جیل کچھ ایسی بری جگہ تو نہ تھی۔ کم سے کم اُس جیل سے جس میں آپ ایک زمانہ سے رہتے ہوں۔ کیا آپ کا شہر۔ ضلع۔ صوبہ یا ملک جیل نہیں۔ جیل میں داخل ہونے سے قبل میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں لیکن یہاں پہونچتے ہی میں اِن کی گرفت سے آزاد ہوگیا۔ مگر آپ لوگ تو جیل میں رہتے ہوئے بھی زنجیروں سے جکڑے ہوئے ہیں۔ میری زنجیریں مرئی تھیں اور آپ لوگوں کی غیر مرئی۔ راج دربار کا خوف پولیس کا دھڑکا۔ جوان بیٹی کی شادی سے قبل بے مائگی کے پیشِ نظر پیدا ہونے والے بھیانک خیالات مریض بیوی۔ کراہتے ہوئے بچوں کے معالجہ کے سلسلہ میں تہی دامانی

کا احساس کیا یہ زنجیریں اُن زنجیروں سے جن میں مجھے جکڑ کر جیل بھیجا گیا تھا کم اذیت انگیز ہیں۔ ہاں تو میں اس مختصر۔ شورشِ کائنات سے آزاد اور آبادی کی متعفن ہواؤں سے پاک قید خانہ کو آپ کے وسیع قید خانہ پر ترجیح دیتا اگر تنہا ہوتا۔ یکہ و تنہا۔ میں تنہا نہیں ہوں میری غم کی ماری زندگی کا دکھ بٹانے والا اس وسیع قید خانہ میں ایک اور بھی ہے۔ رضیہ۔ میری روح رضیہ۔ کیا وہ میری عدم موجودگی میں دامنِ عصمت کو تار تار کئے بغیر اپنے جثہ کی پرداخت پر قادر ہو سکتی ہے۔ نہیں ایسا ممکن نہیں۔ آپ کے عریض و طویل قید خانہ کا ہر ساکن صرف اپنی بہو بیٹیوں کی عفت کا ضامن اور محافظ ہے اور دوسروں کی بہو بیٹیوں کو جنس مشترک سمجھتا ہے۔ آپ تو شہری ہیں۔ آپ کے یہاں بڑے بڑے سینما گھر۔ کلب۔ تھیٹر۔ پارک اور کالج ہیں۔ آپ تو یہ تماشے روز دیکھتے ہوں گے۔ میرے جیل سے فرار ہونے کا محرک ایک راز کا انکشاف ہے۔ ایک عجیب و غریب راز کا۔ آپ کے وسیع قید خانہ میں کوئی ایماندار انسان خوش حال نہیں رہ سکتا ـــــ چوری جس کی پاداش میں مجھے جیل بھیجا گیا میرا پہلا گناہ تھا۔ اگر اسے گناہ کہہ بھی سکتے ہیں آپ کے مذہب میں تو انسانی زندگی کو معرضِ ہلاکت میں ڈالنا گناہ ہے۔ کیوں ہے کہ نہیں اور ہلاکت سے محفوظ رہنے کے لئے وہ ذرائع بھی حلال قرار دئے گئے ہیں جو دوسری صورت میں قطعاً حرام ہیں۔ پھر اگر میں نے ایک مجبور

ترین ہستی کو ہلاکت سے بچانے کے لیئے چوری کی تو کیا گناہ کیا اور اگر آپ کی شریعت میں یہ گناہ ہے تو ہوا کرے۔ میں اب گناہ سے نہیں ڈرتا۔ قید خانہ میں مجھ پر ایک راز کا انکشاف ہوا ہے ایک عجیب وغریب راز کا۔ اگر میں دیرینہ اور پختہ کا رچور ہوتا تو ہرگز سزایاب نہ ہوتا۔ جرائم کا ارتکاب بڑے لوگوں کے اشاروں پر ہوتا ہے۔ انھیں مال غنیمت کا حصہ دار بناکر۔ میں نے قید سے فرار ہونے کے لیئے اسی نظریہ کو آلہ کار بنایا رضیہ کو جیلر کی آغوش کی زینت بنا دینے کے وعدے پر۔ میں نے اُس کے حُسن وجمال کی اس انداز میں تعریف کی کہ جیلر کے مُنہ میں پانی بھر آیا اب مجھے جکمہ دینا آگیا ہے۔ میں اب آپ کے وسیع قید خانہ میں عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے کا اہل ہوگیا ہوں اگر میں شہر میں پیدا ہوا ہوتا تو مجھے تن پروری اور تن پوشی کے لیۓ چوری کی ضرورت لاحق نہ ہوتی عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے کے اور بھی آسان اور محفوظ ہتکنڈے ہیں۔ قید خانہ کی زندگی نے مجھے یہ ہتکنڈے سکھا دئے ہیں۔

میں دیہاتی ہوں۔ میری والدہ کا انتقال بچپنے میں ہوگیا تھا والد پچھلی لڑائی کے بعد والی عالمگیر طاعون کی نذر ہوگئے۔ میں سب کچھ کھوکر اُنھیں بچا لینا چاہتا تھا مگر افسوس کسی دوا نے کام نہ کیا۔ آہ انسان نے انسان کو ہلاک کرنے کے لیئے ہزاروں آلے ایجاد کر لیئے لیکن موت کے چنگل سے نجات دِلانے کے لیئے ایک بھی

آلہ ایجاد نہ کر سکا۔ والد کے انتقال کے بعد میں نے گانوں
کو خیرباد کہہ دیا۔ مختلف شہروں میں محنت مزدوری کر کے عمر
گزارتا رہا۔ کچھ عرصہ ہوا آپ کے شہر کے رکروٹنگ کیمپ میں
بھرتی ہو گیا تھا۔ سمجھ رہا تھا کہ کافی تنخواہ ملے گی۔ رضیہ کو اچھے
اچھے کپڑے بنوا دوں گا۔ میں رضیہ ہی کے لئے نوکری کر رہا ہوں۔
یہاں زیادہ محنت کرنے کی وجہ سے بیمار پڑ گیا۔ بڑی محنت کرنی
پڑتی تھی۔ دن بھر مٹی کھودنا۔ پتھر ڈھونا۔ کھیت تیار کرنا پودوں
میں پانی دینا۔ افسروں کے گھروں پر کام کرنا۔ کنوئیں سے بیلوں
کی طرح پانی کھینچنا۔ میں نے آرام کے خیال سے رخصت مانگی
مگر درخواست نامنظور ہو گئی۔ آخر ایک روز میں وہاں سے فرار
ہو گیا۔ اُس دن سے قید خانہ جانے والے دن تک اس ڈر سے
کہ ملٹری یا پولس والے پکڑ نہ لیں باہر بہت کم نکلتا تھا۔ رضیہ بھی
بیمار رہنے لگی۔ اُس کی دیکھ بھال کی مصروفیت نے آمدنی
کے تمام ذرائع مسدود کر دئے۔ میں نے جس دن چوری کی
تھی اس سے دو روز پہلے سے میں اور رضیہ نے کچھ نہ کھایا
تھا۔ رضیہ کی ساڑیاں ایک ایک کر کے پھٹ گئیں تھیں۔
اس کے جسم پر صرف ایک شلوار تھی دریدہ اور بوسیدہ جو
بمشکل ستر پوشی کر سکتی تھی۔

میں نے چوری کی رضیہ کی ستر پوشی کے لئے۔ رضیہ کو

مسلسل فاقہ کشی سے بچانے کے لئے۔ اُس کی حیات جس کا ایک ایک لمحہ مجھے عزیز ہے قائم رکھنے کے لئے۔ اُس کی مسحور کن آنکھوں کی روشنی زائل نہ ہونے دینے کے لئے اُس کے شگفتہ لبوں کے رس کو قائم رکھنے کی غرض سے۔

اس طویل داستان سے میں نے اکتاکر کہا "مسقطع کا بند سُنائیے حضرت"

قیدی نے میری طرف غور سے دیکھا اور کہنے لگا "شاید آپ اخبارات نہیں پڑھتے۔ میری چوری کی خبر تو تمام اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ اس لئے کی اپنی قسم کی یہ پہلی چوری تھی۔ لوگ ہیرے جواہرات سونا چاندی یا حسین لڑکیاں چراتے ہیں میں نے جھنڈیاں چرائی تھیں جھنڈیاں۔ یونین جیک۔ جس دن فتح یورپ کا جشن منایا جارہا تھا۔ شہر کا چپہ چپہ قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ میرے گھر میں اندھیرا تھا۔ میری روح کی گہرائیوں میں اندھیرا تھا۔ گھُپ اندھیرا۔ شاید اس اندھیرے سے قدرت میری رضیہ کی ستر پوشی کا کام لینا چاہتی ہو۔ رضیہ بخار کی شدت سے تلملا رہی تھی۔ اُس نے دو دن سے کچھ نہ کھایا تھا۔ میرے مسلسل اصرار پر اس نے دودھ پینے کی خواہش ظاہر کی۔ اس وقت آپ لوگ ملٹری اور پولس کی سلامی کا بینڈ سُن رہے ہوں گے یا آتش بازی کا نظارہ کر رہے ہوں گے۔ میں نے موقع

کو مناسب جانا اور دفتروں اور بنگلوں میں لہرانے والے یونین جیک چرانے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ یونین جیک۔ دفتروں اور بنگلوں پر خواہ مخواہ لہرانے والے یونین جیک۔ کیا کپڑے کا اس سے بدترین مصرف کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔ دو یونین جیک سے رضیہ کی ستر پوشی ہو سکتی تھی اور ایک یونین جیک کی قیمت فروخت سے دودھ خریدا جا سکتا تھا۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یہ میری پہلی چوری تھی۔ اس فن میں پختہ کار نہ ہونے کی وجہ سے پکڑ لیا گیا اور جیل بھیجدیا گیا ـــــــ دو گھنٹے ہوئے جیل سے فرار ہوا ہوں۔ شاید اب دوبارہ جیل کا منہ نہ دیکھنا پڑے اس لئے نہیں کہ اب چوری نہ کروں گا۔ چوری کروں گا اور کھلے خزانے۔ مگر یونین جیک کی نہیں جواہرات کی۔ چوری کروں گا پولس عدالت اور راج دربار سے نڈر ہو کر۔ جیل میں مجھے ایک راز کا انکشاف ہوا ہے ایک عجیب و غریب راز کا

شاعرہ

محبت کی ہنہیں جاتی ہوجاتی ہے کتنا مضحکہ خیال ہے۔ قوتِ
جذب و تسخیر ناظرِ نظر میں ہوتی ہے نہ کہ خود حسن میں اور اگر ایسا
نہ ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اپنی بہنوں کے حسن سے انسان اسی حد تک
متاثر و مسحور نہ ہوتا جتنا کہ غیر عورتوں کے حسن سے۔ روزمرہ کے مشاہدات
نے ثابت کر دیا ہے کہ ایسا نہیں ہوتا پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہر شخص یہ سمجھ
لینے میں حق بجانب متصور ہو کہ ؏

کہتے ہیں جسے حسن مرا حسنِ نظر ہے

میں اپنی تازہ تصنیف "نفسیاتِ شباب" کے دوسرے باب کی تمہیدی
عبارت یہیں تک لکھنے پایا تھا کہ "محمود صاحب۔ قبلہ محمود صاحب
حضرت محمود صاحب" کی مسلسل اور سامعہ خراش دستک نے چونکا

دیا۔ بادل ناخواستہ باہر گیا۔ ایک شریف صورت اجنبی۔ قلی اور قلی کے سر پر ٹرنک اور بستر۔ اسلام علیکم اندر تشریف لائیے۔

رسمی معذرت خواہی کے بعد نو وارد نے بتایا کہ وہ صحیح النسل سید ہیں۔ ای آئی آر میں ملازم ہیں۔ دو سال قبل تخفیف میں آجانے کے باعث انھیں علی نگر میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ چونکہ ان کی اکلوتی بچی اختر زمانی سن شعور کو پہونچ چکی تھی۔ بیگم کے اصرار اور بعض بہی خواہوں کے مشورہ سے انھوں نے بچی کا عقد ایک قبول صورت نوجوان سے فرید آباد ریاست حیدرپور میں کر دیا۔ لڑکا حسب نسب کا اچھا بتایا گیا تھا۔ لیکن اب انھیں معلوم ہوا کہ وہ لوگ جرائم پیشہ ہیں اور وہ اس لئے تشریف لائے ہیں کہ میری مدد سے اختر زمانی کو ان سے نجات دلائی جا سکے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ ان کے علم کے مطابق ریاست مذکور کے محکمہ پولس کے حاکم اعلیٰ میرے دوست ہی نہیں بلکہ مجھ سے مشورۂ سخن بھی کرتے ہیں۔ جی میں آئی کہہ دوں کہ کیا میں خدائی کا ٹھیکہ دار ہوں۔ کسی کے بیٹا ہو مبارکبادیں لکھوں۔ کسی کی شادی ہو سہرا میں کہوں۔ میں غزلیں اور نظمیں کہہ کہہ کر دوں اور نام کسی اور کا ہو۔ کچھ نہیں تو شکر کا پرمٹ ہی دلا دو۔ ایک بوری گیہوں ایک درجن ماچس بکس دلوا دو۔ انتہا ان

کا زمانہ قریب ہے صاحبزادۂ بلند اقبال کو کچھ پڑھادو ورنہ فیل ہوجائے گا اور معاوضہ کے نام اللہ بس باقی ہوس۔ درانحالیکہ اگر میں جوتوں کی مرمّت بھی کراؤں تو پورے چار آنے دوں اور اگر حسنِ اتفاق سے جیب میں خوردہ نہ ہو تو نظامِ نو کی رُو سے موچی جوتی رہن رکھ لے۔ رنڈی میری غزل گاکر لاکھوں روپیہ وصول کرے اور اگر خدانخواستہ اپنے ہی شعر سُننے کی میں فرمائش کردوں تو فی شعر مبلغ دو روپیہ رکھوالے آخر یہ کہاں کا انصاف ہے۔ انکسارِ شاعرانہ کی کبھی حد ہوتی ہے۔ سوچنے کو تو میں بہت کچھ سوچ گیا لیکن بجا ارشاد اور بندہ غلام بے دام ہے" سوا منہ سے کچھ نہ نکلا۔ نکلتا بھی کیوں جبکہ اسی قبیل کے چند جملوں کا اعادہ بھی نیچرل شاعری کا معیار قرار پاچکا ہو۔ ہندوستان میں اچھے ادیب و شاعر کیوں نہیں پیدا ہوتے۔ کیا اب بھی اس سوال کے جواب کی ضرورت باقی ہے ——— ؟

ہم اسی شب اس مہم پہ روانہ ہوگئے اور تیسرے روز بہ نیل مرام واپس ہوئے۔ اختر زمانی ہمارے ساتھ تھیں۔ انھیں میں اب تک بیرونِ نقاب نہ دیکھ سکا تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اس خصوص میں میری فطرت ذرا کج واقع ہوئی ہے۔ میں ظاہری حُسن کا قائل نہیں اور ساتھ ہی ساتھ ع

مرا زیں چہ کہ تو شیریں ہے ست درنہ نشاد

شبلی کی طرح مجھے ہمیشہ ایک ایسی عورت کی تلاش رہی جو روح کو تسکین دے سکے اور عورتوں سے زیادہ معصوم ہو۔ مگر اس پُر آشوب دور میں جبکہ بقول اکبر عورتوں کا پردہ مردوں کی عقل پر پڑ گیا ہو۔ ایسی عورت کی تلاش جنوں نہیں تو اور کیا ہے۔ خیر دوسرے روز علی الصبح اپنے مہمانوں کو رخصت کرنے ریلوے اسٹیشن گیا گاڑی چلنے ہی والی تھی کہ خدا جانے کس ضرورت سے اختر نے (میں اختر زمانی کو اختر ہی کہوں گا کیونکہ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا وہ اختر تخلص فرماتی ہیں) اپنا نقاب اُلٹ دیا اور اس طرح کہ ان کی اور میری نگاہیں چار ہوگئیں۔ میں نے کیا دیکھا یہ نہ پوچھئے۔ میری نگاہوں کا مرکز غالب کے الفاظ میں ایک جلوہ گرنے آفت نظارہ" اور میر حسن کی زبان میں وہ ستارہ پڑا ہے پرسے ٹوٹ" تھا۔ میں کھو سا گیا اس لئے نہیں کہ ع

چشم واکردن زمین تا آسماں آغوش داشت

بلکہ اس لئے کہ ع

جلوہ کرد کہ من ہم ہمہ رو گردیدم

میں نے دیکھا اختر بھی خوف زدہ ہرنی کی طرح دم بخود تھیں (؟) تھیں اور اس طرح کہ ع

اُٹھ نہ سکتا تھا مگر سے جنبشِ دامن کا بوجھ

وہ نقاب میں مستور ہوگئیں لیکن اس شان سے ع

جس طرح نکہتِ گُل ہو گلِ نرگس میں نہاں

یا ع جس طرح نشہ مے ہوئے زریں میں نہاں

یا یوں کہئے کہ ع جیسے فانوس میں ہو شمع تجلی روپوش

گاڑی چل دی لیکن میرے دل کی دھڑکن سے کم تیزی کے ساتھ میں واپس گھر تک کیونکر پہنچا یہ کسی اور سے پوچھئے البتہ اتنا مجھے ضرور یاد ہے کہ اس تمام عرصہ میں میرا دل صرف اس ایک مصرع کی تکرار کرتا رہا ع

بہر کند کہ خواہی بگیرد بازم بند

"تنفسیاتِ شباب" کا دوسرا باب، شاید قیامت تک، ناممکل ہی رہے اس لئے کہ اب نہ وہ بلبل و بہار رہی نہ بلکہ وہ نظریہ حُسن و عشق کا زاویہ ہی نہ تھا اب تو زندگی کا مطمح نظر ہے

ساقی مست و بادہ مست و حسن مست و عشق مست

آج پینے کا مزہ پی کر بہک جانے میں ہے

سن چکا تھا۔ غالب کی "ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا" والی شاعری اب مہمل نہ رہی تھی اور نہ جلوہ ریزی بادِ و پرافشانی شمع پر روح کا اہتراز کرنا چیستاں۔ آج بالکل پہلی مرتبہ میں "وہ میرے سامنے سے گزرے اور میرے آسمان و زمین اپنے ساتھ لیتے گئے" کے صحیح مفہوم سے آشنا ہوا تھا ——— اسی عالمِ کیف و سکر میں

بالکل غیر ارادی طور پر میری نظر ایک بیاض پر پڑی جو اس پلنگ کے پاس والے طاقچہ پر پڑی ہوئی تھی۔ جسے گزشتہ شب اختر نے استراحت کا شرف بخشا تھا۔ بیاض کے سرورق پر ایک عجیب و غریب کارٹون تھا۔ ایک متشرع اور بظاہر متقی و پرہیزگار بزرگ صورت انسان کے ہاتھ میں جام و شراب۔ بالمقابل حضرت علامہ اقبال اور زریں حصہ پر علامہ اقبال کا شعر ؎

ز دست تو چو کار نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

پیشانی پر لکھا ہوا تھا "کارِ نادر" تیسرے ورق پر علامہ سیماب کی نظم "مزدور" چوتھے پر حضرت جوش کی نظم "کہانی [illegible]" اور پانچویں پر میری نظم "شب ماہتاب" چھٹویں پر میری ایک غزل پر خود صاحب بیاض کی تضمین۔ ساتویں پر میری شاعری پر محبت آمیز الفاظ میں تبصرہ اور بقیہ اوراق پر ملک کے منتخب شعرا کے منتخب اشعار بہ ترتیب اُٹھا۔ میری اختر شناس۔ شعر فہم اور شاعر نواز بھی ہیں ——
لیکن وہ کہاں گئیں اُن سے دوبارہ ملنے کی کیا تقریب ہوگی مجھے تو اُن کے والد کا پتہ بھی نہیں معلوم اور اُن کی بیاض بھی اس ضمن میں خاموش ہے۔ میں انھیں خیالات میں کھو گیا ——

فطرت کی ستم ظریفی کہئے یا زمانہ کی ناقدر شناسی مجھے

وجہ معاش کے لئے ملازمت اختیار کرنی پڑی اور وہ بھی ملٹری کے محکمہ میں ؏

ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس

شاید فطرت کی اسی ندبوجی تقسیم کا نام ہے۔ ہمارا کیمپ دانا پور میں تھا۔ صبح ایک گھنٹہ پریڈ۔ ایک گھنٹہ دفتر کا کام اور دن بھر لیٹے رہنا یا شعر کہنا یہ تھا زندگی کا معمول۔ اختر کے تصور نے اس بے نمک اور تھکا دینے والے طرز زندگی کو بھی دلچسپ بنا رکھا تھا۔ ان کی یاد اب ناقابلِ برداشت حد تک اذیت دینے لگی تھی۔ رشک و رقابت کی حس خطرناک حد تک تیز ہو گئی تھی۔ دو ہمجنسوں کی مخالفت مجھے گوارا نہ ہوتی تھی۔ جذبہ رشک و رقابت کی شدت کے علاوہ میرا دشمن ایک اور بھی تھا۔ ایک صوبہ دار لمبا تڑنگا خشگیں صورت جوان وہ مجھ سے للّٰہی بغض رکھتا تھا۔ میرے ہر کام میں نقص نکالتا تھا اور افسروں سے چغلی کھاتا تھا۔ ایک روز پریڈ کے بعد میری بندوق اچانک طور پر غائب ہو گئی۔ تلاش بسیار کے باوجود بھی اس کا سراغ نہ ملا۔ صوبہ دار نے رپورٹ کر کے میرے خلاف مواخذہ کی اجازت حاصل کر لی اور دو سپاہیوں کی مدد سے میرے آفس ہی میں مجھے حراست میں لے لیا۔ دوسرے روز میرا بیان قلمبند کرنے کے لئے آفیسر کمانڈنگ آنے والا تھا۔ صوبہ دار اس عرصہ میں متعدد بار

میرے سامنے سے مونچھوں پر "تاؤ دیتا ہوا گذرا۔ آفیسر کمانڈنگ کی آمد میں کوئی ایک گھنٹہ کی "تاخیر ہو گی کہ ایک کمسن لڑکے نے مجھے ایک لفافہ لاکر دیا۔ سرنامہ کے انداز تحریر نے مجھے تھوڑی دیر کے لئے پریشان کر دیا ہو بہو اختر کی تحریر کا انداز۔ میں نے بعجلت تمام لفافہ چاک کر کے خط کو پڑھنا شروع کیا:۔

"میرے دیرینہ محسن! آپ کی بندوق باورچی خانہ کے قریب والے پیپل کے نیچے دفن ہے۔ وہاں یہ کیونکر پہونچی اس راز کا انکشاف میری تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ آپ کے کسی بدخواہ نے آپ کو ذلیل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا فقط

ایک احسان نافراموش"

میرا بیان قلمبند کیا گیا۔ بندوق برآمد ہو گئی اور مجھے رہا کر دیا گیا۔

ایک روز صبح اس لڑکے نے جس نے مجھے خط لاکر دیا تھا میرے پاس آکر کہا کہ صوبہ دار صاحب سخت بیمار ہیں۔ آپ کو یاد کیا ہے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ میں فوراً روانہ ہو گیا۔ صوبہ دار واقعی بیمار تھے۔ اُن کی حالت بگڑ چکی تھی۔ میں اُن کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ انھوں نے ملتجانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ اب اُن کے چہرہ پر خشونت نام کو نہ تھی۔ بدقت اُن کی زبان سے نکلا "میں نے آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ سے اپنے قصوروں کی معافی

چاہوں۔ میں نے آپ کو بہت ستایا ہے، بندوق میں نے ہی چرائی تھی۔ محض آپ کو ذلیل کرنے کے لئے۔ یہی نہیں میں نے اور بھی قصور کئے ہیں اختر کو حاصل کرنے کے لئے میں نے اختر کے وہ خطوط جو وہ وقتاً فوقتاً آپ کو لکھتی رہیں، ڈاک خانہ ہی سے غائب کر دیئے یہ سب کچھ میں نے اختر کی محبت میں کیا۔ میں تمہارا اور اختر دونوں کا قصوروار ہوں۔ اختر اختر یہاں آؤ۔ اب تم روکیوں رہی ہو! اب تمہاری دلجوئی محمود کیا کریں گے یہ بیحد شریف ہیں یہ بے حد محبت کریں گے۔ محمود مجھے معاف کردو اور اختر تم بھی۔ محمود تم سے اختر کی ناز برداری کرنا۔ دیکھو ان کی دل آزاری نہ ہو —— اور وہاں میری جائداد اور دولت تم دونوں کی ہے۔ صوبہ دار صاحب کی روح ان الفاظ میں الجھ کر رہ گئی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

اب اختر میری اور میں اختر کا ہوں۔ اُن کی بیاض میں اس تمام عرصہ میں صرف ایک شعر کا اضافہ ہوسکا اور شاید اب کسی مزید شعر کا اضافہ نہ ہوسکے لیجئے وہ شعر بھی سن لیجئے ؎

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑے
یہ مری جبین نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

لغزش

مقابل والی سیٹ پر آسودۂ خواب مجسمۂ ناز کو میں گھور رہا تھا۔ ریل فراٹے بھرتی اڑی جا رہی تھی وہ سو رہی تھی مست بےخبر جوانی کی نیند۔ اس کی عنبریں زلفوں سے ہوا کے جھونکے کھیل رہے تھے۔ ایک مولوی (صورت شکل سے مولوی ہی نظر آتے تھے) ایک احمق پروانے، اور میرے سوا ڈبہ کا ہر متنفس آسودۂ خواب تھا۔ ریل گاڑی جا رہی تھی خرّاٹے بھرتی ہوئی ہم اپنی منزل سے قریب اور پروانہ عقل کا دشمن پروانہ اپنے مستقر سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ بہت دور۔ شاید اس کا کوئی مستقر ہی نہ تھا۔ یہ احمق برقی قمقمے کے کانچ کی سنگین دیوار کے ارد گرد چکر کاٹ رہا تھا یونہی خواہ مخواہ یہ سوچے سمجھے بغیر

کہ وہ قیامت تک اس دیوار کو نہیں پھاند سکتا۔ میں مقابل کی سیٹ والے محوِ خواب مجسمہ جمال کو گھورے جا رہا تھا یہ جانے یا جاننے کی کوشش کئے بغیر کہ وہ کون ہے اور کہاں جا رہی ہے میں اُس کے سینے میں جوان تنفس سے پیدا ہونے والے لطیف تموّج کے نظارے میں اور مولوی صاحب ایک بوسیدہ اور ضخیم مجلّد میں کھوئے ہوئے تھے۔ پروانہ شمع کو سے۔ میں اُس مجسمۂ ناز سے اور مولوی صاحب شاہد "شاہد معنی" سے ہم آغوش ہو جانا چاہتے تھے۔ پروانے اور لَو کے درمیان کانچ کی دیوار مولوی صاحب اور "شاہد معنی" کے مابین کتاب کی دیوار اور میرے اور اُس مجسمہ ناز کے بیچ میں کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک دیوار حائل تھی سنگین و مستحکم۔ غیرت۔ تقویٰ۔ سماج اور عزتِ نفس کی معصوم پتنگے کی مجبوری پر میرا دل کُڑھ رہا تھا۔ وہ کانچ کی دیوار پر کب تک یونہی تھرتھراتا رہے گا۔ میں نے اُٹھ کر اپنی اسٹک سے مجنونانہ جوش کے ساتھ برقی قمقمے کو پاش پاش کر دیا لَو اور پروانے کے اتصالِ جسمانی کے تصور سے باغ باغ ہو گیا۔ لَو بے نقاب ہو چکی تھی اب اس کے اور پروانے کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ تھی مگر پروانہ آہ اُس کا کہیں پتہ نہ تھا —— مولوی صاحب چونک پڑے۔ وہ میری اس حرکت پر چیں بجبیں تھے مگر میں خوش تھا اس لئے کہ اب میرے اور مولوی صاحب کے

درمیان کوئی دیوار حائل نہ تھی۔ تکلّف کا پردہ اٹھ چکا تھا اور ہم دونوں ہمکلام ہو چکے تھے۔

حسن اتفاق سے مجھے اور مولوی صاحب کو ایک ہی جگہ جانا تھا۔ ہم علی الصّباح سراتھو اسٹیشن پر اتر گئے۔ پروانے کا کھیل ختم ہوچکا تھا۔ حسینہ اُسی دِل رُبائی کے ساتھ محو خواب تھی۔ ڈبہ کے دوسرے متنفّس خراٹے بھر رہے تھے ہمیں دور جانا تھا اور یا پیادہ یا یکوں پر ـــــ کمبھ کے میلے کی وجہ سے تمام یکّے سواریاں لے کر گنگا کا گھاٹ چلے گئے تھے۔ صرف ایک یکّہ کھڑا تھا۔ مریل ٹٹّو والا۔ رات کو کافی بارش ہوجانے سے زمین گیلی اور نرم ہوگئی تھی۔ ہمارے گانوں سیدپور جانے والے یکّے بارش کے ایّام میں راستہ کی خرابی کے باعث دھانہ سے آگے نہیں جاتے۔ اسٹیشن سے دھانہ کا کرایہ عموماً دو روپیہ ہے مگر یکّہ والا آج موقع سے ناجائز فائدہ اٹھانے پر تُلا ہوا تھا۔ بڑی حیل حجت کے بعد دس روپیہ میں راضی ہوا۔ مولوی صاحب ایک زمانہ کے بعد گانوں جا رہے تھے۔ دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہی اُنھوں نے گانوں کو خیرباد کہہ دیا تھا تمام عمر دکن میں "نظام حق" کے قیام کی تحریک میں منہمک رہے۔ جہاں اُنھیں کے قول کے مطابق انھیں اس مشن میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی میرے سوال پر انھوں نے بتایا کہ "نظام حق"

سے قرآنی اسلام۔ حق پژوہی۔ صداقت اخوت و مساوات مراد ہیں۔ مرورِ ایام اور مسلسل غلامی کے باعث مسلمانوں کے دل و دماغ غیر اسلامی جراثیم کی پرورش کے لئے وقف ہو گئے ہیں۔ انھیں جراثیم کے استیصال و اتلاف میں "نظامِ حق" کے قیام کی تحریک کا راز پنہاں ہے۔ مولوی صاحب کے نزدیک اس تحریک کا پروان چڑھنا آسان کام نہ تھا اس لئے کہ آج کا دورِ جاہلیت اس دورِ جاہلیت سے جب آفتاب اسلام طلوع ہوا کہیں زیادہ ظلمت آگیں ہے۔

دھانہ پہنچتے پہنچتے تین بج گئے۔ ابھی ہمیں سات میل اور آگے جانا تھا۔ کوئی ساڑھے تین بجے ہم وہاں سے پیدل روانہ ہوئے۔ ہمارا مزدور بوڑھا اور کمزور تھا۔ صبح سے اب تک ہم نے کچھ بھی نہ کھایا تھا مولوی صاحب ہندو حلوائیوں کی بنائی ہوئی مٹھائی نہ کھاتے تھے اور دھانہ میں کسی مسلمان حلوائی کی دکان نہ تھی۔ پھاگن کا مہینہ تھا۔ سرسوں پھول رہی تھی۔ حدِ نظر تک ہریالی ہی ہریالی تھی۔ بوڑھے مزدور نے ایک مہوہ کے پیڑ کے پاس پہنچ کر کچھ دیر ستانے کی خواہش ظاہر کی مولوی صاحب نے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔ "آگے چل کر نہر کے پل پر ستا لینا"۔ مہوہ کے پیڑ کے پاس پہنچ کر مولوی صاحب کچھ ٹھٹکے۔ سامنے والے کھیت کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس کے ساتھ زیرِ لب کچھ کہا اور چل دیئے۔ ان کے بشرے سے

سراسیمگی اور خجالت کے ملے جلے اثرات نمودار تھے جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ بھیانک خواب۔ اُن کا چہرہ کہہ رہا تھا کہ اگر انھیں بولنے پر مجبور کیا گیا تو وہ رو دیں گے۔ مگر میں کب ماننے والا تھا مولوی صاحب میرے سوالات کی بھرمار سے تنگ آ کر بولے" آج سے پینتیس ۳۵ چالیس ۴۰ برس پہلے بالکل ایسے ہی موسم میں میں اس راستہ سے گذرا تھا۔ شاید دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد۔ میرے ساتھ ایک مزدور تھا بوڑھا اُسی جیسا وہ اس مہوہ کے پیڑ تک پہنچتے اتنا تھک گیا تھا کہ اس میں آگے جانے کی سکت نہ تھی۔ بڑا پرانا پیڑ ہے یہ۔ مزدور کے اشارے پر سامنے والے کھیت سے ایک دوشیزہ مسکراتی اور ہرنی کی طرح اینڈتی ہوئی آئی اور اس وعدہ پر کہ تمام و کمال مزدوری اسے دیدی جائے گی۔ اس نے بوڑھے کو باربرداری کی زحمت سے چھٹکارا دلا دیا اور سامان اٹھا کر میرے ساتھ ہو لی" میں نے پوچھا" کیا عمر ہو گی اس کی مولوی صاحب؟" یہی سترہ اٹھارہ سال کی" مولوی صاحب نے لاپروائی سے جواب دیا "اور شکل و صورت؟" میں نے ڈھٹائی سے پوچھا " بھائی تم تو بال کی کھال نکالتے ہو" مولوی صاحب نے تھک کر کہا" دیہات کی، ہر جوان عورت خوبصورت ہوتی ہے محنت کے باعث ان کے اعضا سڈول ہو جاتے ہیں اور حُسن نام ہی ہے، عمدہ صحت اور متناسب اعضا کا۔"

دن ڈوب گیا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ بوڑھے مزدور نے گھبرا کر کہا

اندھیر بڑھتے جات ہے۔ ہمکا رات کے نہیں سُوجھات ہم اب آگے
نہ جاب نگدنی پور میں رات بھر ٹھہر جاؤ بھنسارین ہم تم کا سید پور
پہنچائے دیب" ہم نے بوڑھے کی رائے پر صاد کیا۔ مولوی صاحب نے
پوچھا نگدن پور میں مسلمانوں کے گھر ہیں؟" "یہاں رنڈی رہت ہیں
یہ ایک رنڈی کیر گانوں آئے ایک گھر پاسی دوئی چمار اور ایک گھر لوہار
کا آئے" بوڑھے نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ یہیں
کہیں ایک سادھو کی کٹی بھی تو ہے" مولوی صاحب نے کہا "ہاں بہت
دن بھئے یہاں ایک سادھو رہت رہے پر تو اب وہ کہو چلا گیا اور کٹیا
گر گئے۔ یہاں اب کونوں کٹیا نہیں نا ہے" بوڑھے نے جواب دیا۔

نگدن پور پہنچ کر بوڑھے نے ایک عالیشان کوٹھی کے دروازے
پر سامان رکھدیا۔ تھوڑی دیر بعد کسی ملازم کی اطلاع پر مکان کی مالکہ
ایک نوجوان وشکیل عورت آگئی۔ بے نقاب۔ بے جھجک۔ مولوی
صاحب کی نظریں زمین پر اور میری اپنے حسین میزبان پر گڑ گئیں۔
بڑی گرمجوشی سے اس نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ دریاں۔ پلنگ۔ تکیے۔ صراحی
پانی گلاس حقہ۔ پاندان سب کچھ آناً فاناً میں مہیا ہو گیا۔ ایک ملازم کو فوراً
کھانا تیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ مولوی صاحب نے اس حکم کے خلاف
بیر کئے ہوتے صدائے احتجاج بلند کی کہ وہ غیر مسلم تو کیا کسی غیر متقی
وغیر متشرح مسلمان کے بھی یہاں کی کوئی چیز استعمال نہیں کرتے۔
ہمارے حسین میزبان نے اپنے پکے مسلمان ہونے کا ہرچند یقین دلانا

چاہا مگر مولوی صاحب مطمئن نہ ہوئے۔
میزبان اور مولوی صاحب کے چہرے مہرے میں بلا کی مشابہت تھی میں اس چیز پر بڑی دیر سے غور کر رہا تھا۔ مولوی صاحب نے لوٹے ڈور سے جو ان کے کسی جھولے میں بندھے ہوئے تھے کنوئیں سے پانی نکال کر وضو کیا اور نماز عشا میں مصروف ہو گئے میں اپنے میزبان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ باتوں باتوں میں انھوں نے کہا "میں کسی نامعلوم شریف مسلمان کی بیٹی ہوں۔ میری ماں میری پیدائش سے کچھ پہلے برادری سے خارج کر دئے جانے پر طوائف بننے پر مجبور ہو گئیں جیسا کہ انھوں نے بسترِ مرگ پر مجھ سے بتایا اُن کی دوشیزگی کا دامن کسی راہ گیر کے ہاتھوں تار تار ہوا تھا۔ وہ مسافر کا سامان مزدوری پر کسی قریب کے گاؤں لے جا رہی تھیں رات پڑ جانے پر کسی سادھو کی خالی کٹیا میں دونوں نے آرام کیا۔ دو جوانیوں کی یکجائی کے نتیجہ کے طور پر ماں بننے کے آثار نمودار ہوئے اور قبل اس کے کہ میں پیدا ہوں انھیں برادری سے خارج کر دیا گیا۔ انھوں نے وہی کیا جو ایسی صورت میں ہر عورت کرتی ہے یعنی الہ آباد جا کر عصمت فروشی کی دوکان کھول دی اور پھر بہت جلد دولت مند بن گئیں۔ یہ گاؤں انھیں کا آباد کیا ہوا ہے اور اب میں اس کی تنہا مالک ہوں اس میں پچاس گھر طوائفوں کے ہیں۔"
نماز سے فارغ ہونے کے بعد مولوی صاحب سو گئے یا سونے

کے بہانے سے چپ سادھ لی۔

صبح جب ہم سفر کے لئے تیار ہو رہے تھے مولوی صاحب میرے پاس آئے اور بولے "میاں دیکھا تم نے گناہ میں نشو و نما پانے کی کتنی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ ایک لغزش جوانی کی ایک خفیف سی لغزش نے کتنی خطرناک صورت اختیار کر لی ہے"۔ شاید مولوی صاحب نے ہماری گفتگو سن لی تھی سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "ایک معصیت کی پیداوار ایک دو نہیں سینکڑوں طوائفیں اور بھڑوے۔ اُف معصیت غیر فانی معصیت۔ تالاب کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو ایک ہلکی سی کنکری پھینکنے پر ایک تموج پیدا ہوگا خفیف بالکل خفیف مگر اس کا سلسلہ اس وقت تک ختم نہ لگا جب تک یہ تموج تالاب کے ہر گوشے پر محیط نہ ہو جائے۔ بالکل یہی صورت معصیت انگیز لغزش کی ہے۔ کتنی ہی خفیف لغزش کیوں نہ ہو اس کے اثرات لا متناہی ہیں"۔ مولوی صاحب کا لہجہ بتدریج درد انگیز ہوتا جا رہا تھا انھوں نے پھر کہنا شروع کیا۔ "کاش نظام حق" کے قیام کا خواب دیکھنے کی بجائے میں اپنی عمر یہ مختصر سی عمر اس پہلی اور آخری لغزش کے اثرات کے زائل کرنے میں صرف کرتا۔ کاش میں اس طوائف گردی کو روک سکتا۔ آہ میری لائی ہوئی وبا خدا جانے کتنے گھروں کو بے چراغ کر دے میری لگائی ہوئی آگ خدا جانے کتنے خاندان کو خاکستر کر دے اف میری اچھالی ہوئی کیچڑ خدا جانے کتنے معصوم دامنوں کو

ملوث کر دے۔ اور تم میاں تم قیود توڑ ڈالنے اور دیواریں منہدم کر دینے کے درپے ہو۔ اتصال جسمانی کو حصول سکون کا ذریعہ بنانے پر تلے ہوتے ہو یہ جانتے ہوتے بھی کہ لو سے ہم آغوش ہو کر پروانہ اپنی حقیقت کھو دیتا ہے۔" آخری الفاظ مولوی صاحب کے گلے میں الجھ کر رہ گئے۔ اب ہم سید پور پہنچ چکے تھے۔

کچھ دن ہوتے نگدن پور کی آبادی میں ایک اور عمارت کا اضافہ ہو گیا ہے۔ ایک شاندار مقبرہ کا جس میں ہمارے مولوی صاحب آسودۂ خواب ہیں، یہاں ہر روز بڑے زور و شور سے محفل سماع منعقد ہوتی ہے چڑھاوے آتے ہیں قوال دور دور سے آکر نگدن پور اور مضافات نگدن پور میں آباد ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی نسل میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔ میں ایک روز مولوی صاحب کے مزار پر فاتحہ پڑھتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ اگر قوالوں کی افزائش کا یہی عالم رہا تو کسی دن ان کے لئے بھی ایک نگدن پور آباد کرنا پڑے گا اور پھر کیا عجب کہ مرور ایام سے ایک دن ایسا بھی آئے کہ "جہاں دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے" کے مصداق دنیا کے چپے چپے پر نگدن پور آباد ہو جائیں۔ طوائفوں اور قوالوں کی بڑھ بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور مولوی صاحب منوں مٹی کے نیچے "نظام حق" کے قیام کی حسرت کو سینے سے چمٹائے ہوئے سو رہے ہیں۔ بے خبر اپنی لغزش اور اس کے عالمگیر اثرات

سے بے خبر ۔ کسے معلوم کہ اُن کی روح " نظام حق " کے قیام کی
حسرت میں اب بھی بے چین ہے " قوالوں کے " اے باد صبا ایں ہمہ
آوردۂ تست " کی وجد آفریں تانوں نے اسے آسودہ اور پرسکون
کر دیا ہے ——— کچھ ہی کیوں نہ ہو مولوی صاحب کے مشن
کی تکمیل ہو چکی زور با وجوہ احسن ۔ یہ بھی تو " نظام حق " ہی ہے —
اور " نظام حق " کب نہ تھا ——

روشنی
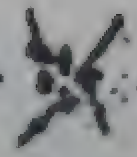
اتوار کا دن تھا۔ میں حسب معمول اپنے کمرے میں لیٹا ہوا خیالات کی گڑیاں جما رہا تھا کہ ایک بڑی بی نے آکر سلام کیا۔ میرے اشارے پر موڑھے پر بیٹھتے ہوئے بولیں "بیٹا آپ کو بیگم صاحبہ نے یاد فرمایا ہے"

"کون بیگم صاحبہ" میں نے پوچھا

"فرخ نگر والی" بڑی بی نے جواب دیا۔

میں نے بیگم صاحبہ کے مکان کا پتہ پوچھنے کے بعد شام کو ملنے کا وعدہ کرکے بڑی بی کو رخصت کر دیا۔ یاد فرمائی کا سبب پوچھنا بیکار تھا اس لئے کہ شہر میں مجھے عموماً بچوں کے ٹیوشن ہی کے سلسلے میں یاد کیا جاتا ہے۔

بڑی بی کے جانے کے بعد میں پھر اُسی دنیا میں پہنچ گیا۔ اگر لاٹری پھنس گئی اور لاکھ دو لاکھ مل گئے تو پہلے تو جی کھول کر تمام دنیا کی سیر ہوگی اور پھر اپنے گاؤں میں ایک خوبصورت کوٹھی بنا کر آرام و اطمینان کی زندگی بسر کی جائے گی۔ ہر وقت شعر و شاعری کا چرچا رہے گا۔ ایک شاندار کتب خانہ اور خدمت کے لئے نوجوان و شکیل عورتیں ہوں گی شاید ہر جوان آدمی اوقات فرصت میں یہی خواب دیکھتا ہوگا۔

متاہل زندگی بسر کرنے کے باوجود میرے تحت الشعور میں خدا جانے حسین عورت کیوں مسلط تھی یہ کہنا کہ رضیہ قبول صورت سلیقہ شعار اور تعلیم یافتہ نہیں زیادتی ہوگی۔ اس میں وہ تمام محاسن موجود ہیں جو بیوی میں ہونا چاہئیں۔ پھر میرا اس سے والہانہ محبت نہ کرنے کا اس کے سوا اور کیا سبب ہو سکتا ہے کہ وہ سادہ باش۔ اطاعت شعار اور سنتوتی ہے۔ کم گوئی اور سنجیدگی اس کی طبیعتِ ثانیہ ہے خود آرائی۔ خود بینی اور تصنع سے دور بھاگتی ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ شادی کے ابتدائی دو تین ہفتوں کو چھوڑ کر میں نے کبھی بھی اس سے والہانہ محبت کا اظہار کیا ہو یا کبھی رضیہ ہی نے اس باب میں پہل کی ہو۔ ہاں میری علالت یا پریشانی کے موقع پر البتہ رضیہ کی طرف سے اس چیز کا اضطراری طور پر ظاہر ہوتا رہا ہے۔

میں حسبِ وعدہ شام کو بیگم صاحبہ کے درِ دولت پر حاضر ہوا۔ آداب و تسلیم کے بعد انھوں نے فرمایا۔

"عفّت کو افسانہ نگاری کا جنون ہے۔ اس فن کی تکمیل کے لئے مجھے ایک راہ نما کی ضرورت ہے۔ آپ کے افسانے ہم نے رسائل میں دیکھے ہیں۔ مقامی اربابِ ذوق نے بھی آپ کی صلاحیتِ کار پر صاد کیا ہے۔ میں ممنون ہوں گی اگر آپ اپنے قیمتی وقت کا کچھ حصہ عفّت کے شوق کی تکمیل کی نظر کر سکیں گے آپ جو کچھ فرمائیں گے پیش کر دیا کروں گی"

میں جواب سوچ ہی رہا تھا کہ عفّت آگئیں۔ انھوں نے متبسم نظروں سے بیگم صاحبہ کے ارشاد کی تائید کی ——— میں بیحد مصروف زندگی بسر کر رہا ہوں مگر خدا جانے کیوں انکار نہ بن پڑا۔ اٹھنے ہی والا تھا کہ چائے بسکٹ اور پھل آگئے

بیگم صاحبہ کے یہاں جاکر میں آفت میں مبتلا ہو گیا عفّت کا شاداب و شگفتہ چہرہ ہر وقت نگاہوں میں رقص کرتا۔ سات دن بڑی مشکل سے کٹے۔

عفّت کا نقشِ اوّلین دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ اصلاح کی خدمت عادت تک انجام دینی پڑے گی۔ عبارت بے ربط۔ پلاٹ مضحکہ۔ زبان پست اور بازاری۔ محاورے ٹکسالی باہر۔ میں نے افسانے کو بڑی محنت سے کسی قابل بنایا بلکہ یوں کہنا

چاہیئے کہ ایک تازہ افسانہ لکھ کر دیا۔ یہ افسانہ کسی ماہناموں میں چھپا۔ بیگم صاحبہ اور عفت بڑی خوش تھیں اور میری مداح بھی۔

چھ ماہ کے اندر اندر متعدد معیاری افسانے عفت کے نام سے شائع ہو گئے ـــــ اس تمام عرصہ میں بیگم صاحبہ مجھ پر بیحد مہربان تھیں۔ اکثر عفت کو تفریح کے لئے ساتھ لے جانے کا بھی مجھ کو فخر بخشا جاتا رہا۔

میں گھر کی طرف سے روز بروز بے پروا ہوتا جا رہا تھا ـــــ تنخواہ لا کر دیدی۔ دونوں وقت کھانا کھا لیا رات کو کبھی بارہ کبھی ایک بجے گھر میں داخل ہوا اور پڑ کر سو رہا۔ مجھے اب رضیہ کی ہر چیز بری معلوم ہوتی۔ لباس بھدا۔ مسکراہٹ مضحکہ خیز جسم مدقوق اس کے ہر کام میں نقص نکالنا میرا معمول ہو گیا تھا۔ دنیا بھر کا غصہ اسی پر اترتا۔ وہ بیمار پڑتی اور لوٹ پوٹ کر اچھی ہو جاتی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اسے کبھی دوا لا کر دی ہو۔ لیکن اس نے کبھی شکایت نہ کی۔ اس کی چتون پر کبھی میل نہ آیا۔ میں اُسے جھڑکتا وہ سنتی رہتی۔ میں اُسے جھڑکتا وہ پی جاتی۔ میں اُسے گالیاں دیتا وہ مسکرا دینے کی کوشش کرتی۔

ایک مرتبہ بیگم صاحبہ بیمار پڑیں۔ عفت کو غمگین دیکھ کر میں تڑپ گیا۔ ایک روز عفت نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا

"ماسٹر صاحب ڈاکٹر کا بل چکانا ہے۔ ابھی گاؤں سے روپیہ نہیں آیا۔ کیا آپ اس سلسلہ میں کچھ مدد فرماسکیں گے"

"بسرو چشم" میں نے کہا۔

مگر ایک ہزار روپیہ مجھے کون دے گا۔ رضیہ کا زیور گرو رکھ کر یہ رقم حاصل کی جاسکتی تھی۔ میں آج ایک مدت کے بعد رضیہ سے مسکرا کر بولا "رجو میرے ایک دوست کو ایک ہزار روپیہ کی ضرورت ہے اُن کی آبرو خطرے میں ہے۔ میں نے شام تک رقم پہنچا دینے کا وعدہ کرلیا ہے۔ تمہارے زیور......"

رضیہ نے آن واحد میں خنداں پیشانی کے ساتھ زیورات کا صندوقچہ میرے سامنے لاکر رکھ دیا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک تھیلی سے ایک ہزار روپے کے نوٹ نکال کر اُس نے یہ کہتے ہوئے میرے ہاتھ میں رکھ دیئے "آپ کی کمائی سے میں نے یہ روپے بچائے ہیں اور اسی دن کے لئے" میں رضیہ کا منہ تکتا رہ گیا

عفت کے افسانوں کا مجموعہ بڑی آب و تاب کے ساتھ مارکٹ میں آیا۔ مقدمہ شہر کے ایک نامی گرامی پروفیسر کے قلم کا چکیدہ تھا۔۔۔ یہ پروفیسر صاحب اکثر و بیشتر بیگم صاحبہ کے یہاں آتے رہتے تھے اور بیگم صاحبہ کے قول کے مطابق اُن کے دور کے رشتہ دار بھی تھے۔ افسانوں کے مجموعہ پر رسائل نے شاندار تبصرے لکھے ویسے بھی رسائل کے مدیر خواتین کی ہر چیز کو

سراہنے میں لطف محسوس کرتے ہیں۔ بعض احباب کی زبانی معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ فرماتی ہیں کہ تمام کے تمام افسانے عفت کی کاوشِ وجودت کا نتیجہ ہیں۔ ان پر کسی کی اصلاح و مشورہ نہیں۔ میرے لئے فرمایا گیا کہ وہ غریب اصلاح دینا تو درکنار یہ بھی نہیں جانتے کہ افسانہ نام کس جانور کا ہے۔ عفت خود ابھی دس سال تک انہیں افسانہ لکھنا سکھائے ــــ میں نے اس بات کی شکایت نہ کبھی بیگم صاحبہ سے کی اور نہ عفت ہی سے۔ البتہ یہ ضرور محسوس کر رہا تھا کہ عفت اب مجھ سے مل کر خوش نہیں ہوتی۔ میری ملاقات سے اس کی پیشانی پر شکنیں سی نمودار ہو جاتی ہیں اور بیگم صاحبہ بھی میری موجودگی میں گم سُم رہتی ہیں۔

مَیں نے ایک روز شام کو بیگم صاحبہ کے درِ دولت پر دستک دی تو جواب ملا کہ سب لوگ کہیں دعوت میں گئے ہیں۔ حالانکہ میں نے عفت کے شرمیلے قہقہوں کی گونج دور سے سُن لی تھی جو ایک مردانہ قہقہہ میں مدغم ہو رہی تھی۔ بارش راستہ ہی میں شروع ہو گئی تھی۔ میرے بیگم صاحبہ کے یہاں پہنچتے پہنچتے زور پکڑ گئی اور زور بندھتا ہی جا رہا تھا ــــ بارش کے تھمنے کے انتظار میں میں برآمدے میں اور ایک ٹوٹے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ کوئی پون گھنٹہ کے بعد بوندیں تھمیں اور میں نے گھر کی راہ لی ــــ

لے کر چیخ مار کر بے ہوش ہو گئیں۔ شاید انھیں یہ وہم ہوا کہ خدا نخواستہ آپ کے دشمنوں پر یہ افتاد پڑی ہے۔ اور میں ان سے حقیقت حال چھپا رہی ہوں"

میری آنکھیں کھُل گئیں۔ میری رضیہ کتنی شوہر پرست ہے میں نے اس پر کیا کیا ظلم نہیں توڑے۔

میں چاہتا تھا کہ اُس کے قدموں پر گر کر معافی مانگوں کہ اُس نے میرا نام لے کر آنکھیں کھولدیں۔ شاید میری آواز اُس نے سن لی تھی۔۔۔ اس نے میری طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا اس پر مسرت چھا گئی اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھ گئے۔ اب میں تاریکی سے روشنی میں آ چکا تھا اور میری حد نگاہ تک روشنی ہی روشنی تھی۔

عفت کی سرد مہری اور بیگم صاحبہ کی خود غرضی پر دل کڑھ رہا تھا۔ کتنی بے مروت اور خود غرض ہے یہ دنیا۔ میرا دماغ انھیں خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ رضیہ میرا انتظار کرتے کرتے تھک کر سو گئی ہوگی اور دروازہ کھلوانے کے لئے حسب معمول چیخنا پڑے گا۔ مگر آج گھر میں خلاف معمول چہل پہل تھی — میری آواز پر پڑوسن نے جھٹ دروازہ کھولدیا گھر بھر عورتوں کا جمگھٹا تھا۔ محلہ کی شاید ہی کوئی عورت ہو جو موجود نہ ہو قبل اس کے کہ میں کسی سے کچھ پوچھوں پڑوسن نے کہنا شروع کیا۔

"رضیہ بی بڑی دیر سے بیہوش ہیں۔ آج بارش کی زیادتی سے گندا نالا بہت چڑھ گیا تھا۔ کئی کنجڑوں کی دوکانیں بہ گئیں۔ ایک سانڈ بہ گیا۔ ایک بابو بہ گیا۔ بابو کی نعش باوجود تلاش اب تک نہیں مل سکی۔ بارش شروع ہونے سے پہلے آپ کے نہ آنے سے وہ متفکر تھیں جوں جوں بارش کا زور بڑھتا جاتا تھا اُن کی پریشانی بڑھتی گئی۔ مجھ سے کئی دفعہ کہا کہ حمیدا کے باپ کو بھیجکر آپ کی خیریت دریافت کروں مگر بارش بند ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی اور پھر آپ کو ڈھونڈنے بھی کوئی کہاں جاتا۔ محلہ میں جب یہ خبر پہنچی کہ ایک بابو بھی بہ گیا ہے اور میں نے آکر رضیہ بی سے بتایا تو وہ آپ کا نام

عذاب

ڈبیہ سے پان نکال کر منہ میں رکھتے ہوئے بوڑھے نے کہا
"اُن شہروں میں جہاں ضروریاتِ زندگی نسبتاً ارزاں ہیں۔
پدم پور کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہاں ریلوے کا بڑا
دفتر ہونے کے باعث کلرکوں کی بڑی کھپت ہے اور یہی وجہ
تھی کہ امتحان کا نتیجہ برآمد ہوتے ہی میں پدم پور پہنچ گیا۔
ایک میٹرک فیل اور بالخصوص وہ میٹرک فیل جس کا
کوئی عزیز کوئی بڑا عہدہ دار یا سرکاری خطاب یافتہ نہ ہو
اس ملک میں کلرک کے سوا بن ہی کیا سکتا ہے۔ خلافِ توقع
میری درخواست پر مجھے ریلوے ڈویژن میں جگہ مل گئی۔ یہ عجیب و
غریب جگہ تھی۔ جس شخص کو جتنی کم تنخواہ ملتی اُسے اتنا ہی

زیادہ کام کرنا پڑتا۔ پنکھا پکڑ کر دن بھر پنکھا کھینچنے کا معاوضہ
مہینہ بھر بعد نو روپیہ اور چپراسی کو دن بھر دوڑ دھوپ کرنے کے
صلہ میں ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو تیرہ روپے ملتے۔ کلرکوں کی
جن میں سے میں بھی ایک تھا اور بھی بری حالت تھی پچیس روپیہ
مہینہ کے عوض میں انھیں دن بھر ڈسپیچ۔ رسیٹ یا ٹائپ میں
پلا رہنا پڑتا۔ پرانے کاغذات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر فائلوں سے
نکالنا۔ قاعدہ قانون کی کتابیں پڑھ کر حوالہ دینا اور چٹھیوں پر
نوٹ لکھنا پڑتا۔ کام سب کلرک کرتا۔ صاحب بہادر صرف دستخط
ثبت فرما کر فائلیں واپس کر دیتے —— اس چھوٹی سی جگہ میں
بیشمار نشیب و فراز تھے۔ سو روپیہ ماہانہ سے لے کر تین ہزار
روپیہ ماہانہ پانے والے انسان ایک ہی جگہ اپنے اپنے کام
میں منہمک دیکھے جاتے۔ مساوات انسانی کی تذلیل شاید
دفتروں سے زیادہ اور کہیں نہیں ہوتی —

صاحب بہادر عموماً بنگلہ پر ہی کام کرتے۔ یہاں ہر وقت
ضرورت مندوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ صاحب بہادر کا پرسنل
کلرک ہونے کی وجہ سے ہر وہ شخص جو بنگلہ پر آتا پہلے مجھے
سلام کرتا تب کہیں صاحب بہادر سے ملاقات ہوتی۔ یہاں
پہنچ کر مجھے ایک فائدہ یہ بھی پہنچا کہ کھیل تماشوں کے فری
پاس بے طلب آجاتے۔ گارڈن پارٹیوں میں مجھے خصوصیت

کے ساتھ یاد کیا جاتا۔ کنٹرول کا زمانہ تھا لوگ معمولی معمولی چیزوں کے لئے ترستے اور میرے یہاں فواکہات کا انبار لگا رہتا۔ خود کنٹرول کے حکام وقتاً فوقتاً مجھے ضرورتا پُرسی کرتے رہتے۔ اگر میں چاہتا تو رشوت کے ذریعہ کافی دولت جمع کر لیتا لیکن میں نے کبھی رشوت نہیں لی۔ شاید بزرگ خاندان میں تربیت پانے کا اثر ضمیر پر غالب تھا مگر سستے نرخ پر اشیاء حاصل کرنا اور خوشامد پسندی بھی تو ایک طرح کی رشوت ہی ہے۔ میری نگاہ میں کوئی ایسا حاکم نہ تھا جو کھلے خزانے رشوت نہ لیتا۔ لیکن انھیں کون پکڑتا۔ رشوت خواروں کو گرفتار کرنے والے یہی تو تھے مگر قیامت میں یہ کیا جواب دیں گے غریبوں کی قیامت اس جہاں میں ہوتی ہے اور امیروں کی قیامت اس جہاں میں ہوگی۔ آخر ان لوگوں کو بداعمالیوں کی سزا کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں ملنی ہی چاہیئے۔ یہی چیز تو عقبیٰ کے یقین کو مستحکم کرتی ہے۔

صاحب بہادر کو میرج رجسٹرار کے اختیارات بھی حاصل تھے۔ ہر مہینہ دو ایک سول میرج ضرور ہوتیں۔ کسی عیسائی عورت کی ہندو کے ساتھ اور ہندو عورت کی مسلمان کے ساتھ منسلک ہو جانے میں بظاہر کوئی قباحت نہیں لیکن میں کسی مسلمان عورت کو غیر مذہب سے شادی کرتے ہوئے

دیکھ کر بے حد ملول ہوتا ۔ شاید بر بنائے تعصب نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ جو شخص خلطِ مذہب کی جرأت کر سکتا ہے وہ نقصِ مذہب سے بھی خائف نہیں ہو سکتا اور قتل و غارت رہزنی اور زنا جیسے افعال شنیعہ کا مرتکب ہونا اس سے مستبعد نہیں ۔

وہ لیڈر جو شہر میں " ظالم سرکار نہیں رکھنی " کے نعرے لگاتے پھرتے ہیں اُس گھر میں داخل ہوتے ہی بھیگی بلّی بن جاتے ۔ مسمّی صورت ۔ ہر بات میں جی حضور ۔ بہت بہتر سرکار ۔ دست بستہ اور نگاہ بپا ۔ خطاب یافتہ حضرات کو اُن کے اصل روپ میں یہیں دیکھا جا سکتا تھا

صاحب بہادر سے عوام سے ملاقات کے اوقات و ایّام مقرر تھے لیکن عموماً شہر کے بڑے آدمی ہی صاحب سے ملاقات کے لئے آتے ۔ غریب شاید اس لئے نہ آتے ہوں کہ وہ اپنے تمام معاملات خدا کو سونپ دینے کے عادی ہو گئے ہیں وہ دوسری دنیا کے فیصلہ پر راسخ اور غیر متزلزل عقیدہ رکھتے ہیں اور شاید موجودہ حکومت سے انھیں اگر کوئی فائدہ پہونچا ہے تو یہی کہ یہ خدا پر زیادہ بھروسہ کرنے لگے ہیں ۔

دولت ۔ ثروت ۔ موٹر ۔ ریڈیو ۔ بنگلہ ۔ باغ ۔ ماہ پارہ بیوی خوش نما فرنیچر آیہ ۔ خان ساماں ۔ بیرا ۔ مالی ۔ بٹلر ۔ شوفر اور خُدا جانے کتنے لواحقین کی موجودگی پر بھی بنگلہ میں رونق نہ تھی ، ۱۲ بجے کے بعد ملاقاتی جب اپنے گھروں کو واپس ہو جاتے بنگلہ کی فضا پھر

گورِ غریباں کا سا سکوت طاری ہو جاتا۔ البتہ کبھی کبھی گھنٹی جو صاحب بہادر بیرے یا جمعدار کی طلبی پر بجائے یا کسی نوبہار حسن اینگلو انڈین دوشیزہ کا جو تلاش ملازمت کے پردہ میں صاحب بہادر سے ملنے کے لئے آتی خفیف سا قہقہہ یا ہلکی سی درد آمیز چیخ فضا کے سکوت کو توڑ دیتی۔ ورنہ صاحب خموشی سے اپنی میز پر اور میم صاحب اوپر کی منزل میں اپنا اپنا کام کرتے رہتے۔ جس روز صاحب بہادر دورے پر باہر جاتے بنگلہ ملازمین کے قہقہوں سے گونجتا رہتا اور کبھی کبھی کسی دیہاتی گیت کے کیف انگیز نغمے فضا میں تحلیل ہونے لگتے۔ نغموں میں آسودہ قہقہوں کی گونج بھی شامل ہوتی۔ میں عرصہ سے اِن نغموں کو سنتا آیا تھا اور سمجھا کرتا تھا کہ بنگلہ کی عقبی سڑک سے گذرنے والی دیہاتی عورتیں شہر جاتے ہوئے گاتی ہیں۔ ایک روز صاحب دورے پر گئے ہوئے تھے اور میم صاحب صبح سے غائب تھیں۔ وہ ہمیشہ صاحب کی عدم موجودگی میں بنگلہ سے باہر ہی رہتی تھیں۔ میں کمرہ کی گھٹی ہوئی فضا سے نکل کر باغ میں ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد حسب معمول نغموں کا سیلاب پھوٹ پڑا۔ بے حد مسحور کن ہوتے تھے یہ نغمے۔ میں نغموں کے آدھار پر آگے بڑھتا گیا۔ باغ کے خاتمہ پر ایک پرانے برگد کے نیچے ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی اور نغمے یہیں سے پھوٹ رہے تھے۔ ایک نوجوان لڑکی میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس جھونپڑی میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ اور اسی کے شراب ریز ہونٹوں پر نغمے مچل رہے تھے۔ ناخواستہ

طور پر میری نگاہیں اُس جانِ نغمہ سے دوچار ہوگئیں۔ میں ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا اور بڑی دیر تک بے خیالی کے عالم میں جہاں کا تہاں کھڑا رہا۔ لڑکی نے بڑا سا گھونگٹ نکالنے کے ساتھ نغموں کا گلا گھونٹ دیا۔ باغ کا مالی جو شاید اس جانِ نغمہ کا مالک تھا مجھے دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں مڑ پڑا۔ مالی تھوڑی دور تک میرے ساتھ آیا۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا مگر میرا ذہن اُس کے الفاظ کے مفہوم کو قبول نہ کر سکا۔ اس لئے کہ میں کہیں اور تھا۔ فلسفۂ مسرت کی گتھیوں میں الجھا ہوا۔ اتنا عظیم الشان بنگلہ اور شہرِ خموشاں سے زیادہ پرسکوت۔ اتنی حقیر جھونپڑی اور فردوس درکنار۔

آخر یہ بیس روپیہ ماہوار پانے والا مالی کیوں مسرور و مطمئن ہے اور یہ جانِ نغمہ اس نیم وحشی اور جاہل انسان کی رفاقت سے کیوں اتنی مسرور ہے۔ شاید یہ جہل کی برکت ہو۔ ہاں جو دماغ فتح کے تصور سے ناآشنا ہیں۔ شکست کا خیال انھیں کب ملول کر سکتا ہے۔

آخر بنگلہ بنگلہ ہی ہے ایک دن اس میں بھی زندگی کے آثار نمایاں ہوکر رہے۔ لیکن افسوس یہ آثار دیرپا نہ تھے۔ ایک روز جب میں کام کی کمی کی وجہ سے کاغذ پر چڑیاں بنا رہا تھا۔ صاحب کے کمرے سے بنگلہ کے اندر جانے والا دروازہ بڑی زور سے کھلا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرے کمرے میں [illegible] زور زور سے چلنے اور میزوں اور کرسیوں

کے آپس میں ٹکرانے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر دو شخصوں کے زور زور سے بولنے اور ساتھ ہی ساتھ فائر کے دھماکے نے ہمیں چونکا دیا۔

آگے آگے جمعدار اور پیچھے میں کمرے کی اوپری منزل پر پہونچے آہ نہ پوچھئے ہماری آنکھوں نے کیا دیکھا۔ میم صاحب کی لاش پلنگ پہ تڑپ رہی تھی اور ایک نوجوان اور تندرست و توانا سو بجرا اوپر کی کھڑکی سے کود کر بنگلہ کی عقبی سڑک پر بھاگتا ہوا جا رہا تھا۔ نعش کے قریب پہونچتے پہونچتے دوسرا فائر ہوا اور میم صاحب کے نعش کے برابر دوسری نعش تڑپنے لگی یہ صاحب بہادر تھے۔ میم صاحب کی نعش عریاں تھی۔ جس پر ہم نے چادر ڈالی تھی۔ قریب ہی پیمانوں اور شراب کی بوتل کے ٹکڑے پڑے ہوتے تھے۔ شراب ارغوانی صاحب اور میم صاحب کے خون میں مل کر خون بن گئی!

بوڑھے نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "میں نے غلط کہا تھا کہ امیروں کا حشر و نشر دوسری دنیا میں ہوتا ہے۔ ہماری طرح امیروں کا حشر و نشر بھی اسی دنیا میں ہوتا ہے۔ کیا ہمارا صاحب دنیا ہی میں جہنم بکنار نہ تھا۔ کیا وہ پھولوں کی سیج کے دھوکے میں روز انگاروں پر نہ سوتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ اب اس بنگلے میں ہمیشہ روحوں کے خوف سے کوئی صاحب نہیں رہتا۔ مگر جھونپڑے سے ابھی بھی مدہوش کن نغمے بلند ہوتے رہتے ہیں"

فرض

صفدر بہت دنوں کے بعد وطن گیا تھا۔ اس کا وہاں تھا ہی
کون؟ ایک ضعیف ماں دو تین بارانی کھیت اور ایک کچے مکان کے
سوا۔ ماں کے گذارے کے لئے وہ ہر ماہ دس روپیہ بھیج ہی دیا کرتا
تھا۔ ملازم ہونے کے بعد وہ کبھی وطن نہ گیا تھا اور اب بھی نہ جاتا
اگر اُسے اپنی دو بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہونے کا خیال نہ
ستاتا۔ دونوں عرصہ ہوا سیانی ہو چکی تھیں وہ اپنی برادری کے
علاوہ ان کی شادی کہیں اور نہ کر سکتا تھا —— اُس کے خاندان
کے لڑکے یا لڑکیاں دوسری برادری میں نہیں بیاہے جاتے ——
وہ صحیح النسل تھا۔ اگر وہ غیر کفو میں اپنی بیٹیاں بیاہ دیتا تو اس
کے خاندان اور دوسرے خاندانوں میں کونسی خصوصیت وجہ امتیاز ہوتی

— نہیں وہ اپنے آبا و اجداد کی توہین گوارا نہ کر سکتا تھا۔ صحیح النسل کی اُن زنجیروں کے توڑنے کی اس میں سکت نہ تھی جو پُشتہا پشت سے اس کے بزرگ سنبھالتے چلے آتے تھے۔ صفدر کا گانوں ریلوے اسٹیشن سے ۱۷-۱۸ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ جب اس نے گانوں چھوڑا تھا منشی احمد یار خان صاحب کے مکان کو چھوڑ کر سب مکان کچے تھے۔ احمد یار خاں صاحب پرانے پنشنر جولدار تھے گانوں میں مسلمان زمیندار، کسان اور کچھ شاگرد پیشہ رہتے تھے اور ان میں سے بعض نے ریل گاڑی بھی نہ دیکھی تھی اِن لوگوں کی زندگی بے حد سادہ اور معصوم تھی۔ یہ لوگ آپس میں لڑنا جھگڑنا جانتے بھی نہ تھے۔

لیکن ۱۷-۱۸ سال کے اندر ہی اندر گانوں کی کایا پلٹ ہو گئی ہر اعتبار سے صفدر تو سمجھ رہا تھا کہ جب وہ گانوں پہنچے گا تو نالاب پر کھپرے پارنے والے۔ مکان چھانے والے۔ کھاد ڈھونے والے حتیٰ کہ گانوں کا ہر فرد بشر اس کے سوٹ بوٹ۔ نکٹائی ہیٹ۔ کیمرا چمڑے کے سوٹ کیس، ہول ڈول اور دو نالی بندوق اور اس کی بیوی کی زرق برق ساڑھی۔ بلاؤز۔ ایرنگ اور طلائی چوڑیوں اور اس کی بیٹیوں کی ریشمیں شلواریں اور اونچی ایڑی کی جوتیوں کو دیکھ کر ہکا بکا رہ جائیں گے اور جب اس کے گھر پر گراموفون اور ہارمونیم بجا کریں گے تو گانوں کی عورتیں اور بچے جمع ہو کر اس کے ہمنول پر عش عش کریں گے۔ لیکن گانوں کی تو کایا ہی پلٹ چکی تھی —

کچے مکانوں کی جگہ عالیشان کوٹھیاں کھڑی تھیں۔ خود اس کے اور دوچار شاگرد پیشہ لوگوں کے مکانات کو چھوڑ کر۔ چونکہ اس کے گھر تک یکّہ نہ جا سکتا تھا وہ بڑی دیر تک یکّے سے سامان اتار کر مع اہل و عیال محفل خانے کے برآمدے میں کھڑا رہا۔ مزدور کے انتظار میں۔ مگر وہاں مزدور کہاں تھا وہ کھڑا ہی رہتا اگر مدّی چاچا اتفاق سے اِدھر نہ آ نکلتے مدّی چاچا نے دو ایک چماروں کو بلا کر صفدر کے سامان اور بیوی بچوں کو مکان پر پہنچا دیا۔ اور صفدر کو ساتھ لئے ہوئے عبداللہ خاں صاحب کے یہاں چلے گئے۔ جن کی بیٹی کی آج رخصتی تھی۔ مدّی چاچا نے بتایا کہ گاؤں کے تمام نوجوان ملٹری میں ملازم ہو گئے ہیں اور یہ اونچی اونچی کوٹھیاں انھوں نے ہی بنوائی ہیں۔ لیکن اتنے قلیل عرصہ میں اتنی عالیشان کوٹھیوں کے بنوانے کے لئے رقم کیسے فراہم ہو گئی۔ جنگ ۱۹۳۹ء ہی میں تو شروع ہوئی تھی ابھی تو پورے چار سال بھی نہیں ہوئے اگر تمام کے تمام نوجوان کپتان کے عہدے سے بھرتی ہوئے ہوتے اور اپنی تنخواہ سے ایک پائی بھی نہ خرچ کرتے تو بھی اتنی بھاری رقمیں جمع نہ ہو سکتیں۔ لیکن مدّی چاچا نے بتایا بعضوں نے سپلائی ڈیپارٹمنٹ میں بعض پولس میں اور بعض کنٹرول میں بھی ملازم تھے اور بعضوں نے مٹی کے تیل، کپڑے۔ اناج اور گڑ شکر کی دوکانیں بھی کھول لی تھیں۔ کلوا سپلائی میں بابو تھا اور اس نے چھ ماہ کے اندر اندر چالیس ہزار روپے گھر والوں کو دئے تھے۔ سردار کنٹبل کو ایک ہی معاملہ میں

پچاس ہزار روپے بل گئے تھے ۔۔ گانوں کے کئی لڑکے کنٹرول کے انسپکٹر تھے۔ اور اُن کی کمائی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ وہ ایک ایک دن میں دو دو ہزار روپئے دوکانداروں سے اینٹھ لیتے تھے ۔ اور دوکانداروں کی کمائی اندھی تھی ۔

عبداللہ خاں صاحب کے دروازے پر پہونچ کر اُس نے دیکھا کہ مکانات ہی نہیں گانوں کی ہر چیز بدل گئی ہے۔ نوجوانوں عورتوں اور بچوں کے لباس۔ وضع قطع ۔ چال ڈھال، طورو طریق۔ طرز بودو باند اور عادات و اخلاق سبھی میں نمایاں تبدیلی واقع ہو گئی ہے ۔ گنتی کے بزرگ ایسے تھے جو نہ بدلے تھے اور وہ بدلتے بھی کیسے۔ بوڑھا بیل اپنی لیکھ نہیں چھوڑتا ۔

لمبے لمبے انگریزی فیشن کے بال ۔ رسٹ واچ ۔ فاونٹین پین فیس پاوڈر کریم ۔ نولئے باٹا کی چپیں۔ اونچی ایڑی کی جوتیاں۔ ساڑیاں۔ سگرٹ ۔ لونڈر شراب ۔ قہقہوں میں مدغم گفتگو۔ انگریزی لب ولہجہ۔ بے حیائی ۔ بے ادبی ۔ ہمہ دانی کا خیال۔ مسلم لیگ کانگرس کمیونزم کیا تھا جو گانوں میں نہ تھا ۔

صفدر سے جو ملتا یہی پوچھتا کتنے بچے ہیں۔ کیا تنخواہ مل رہی ہے ۔ بیٹیوں کی شادیاں کب کروگے ۔ شادیوں کے لئے کتنا جمع کیا"۔ کوئی کہتا بھائی آپ تو بڑے آدمی ہیں۔ پرانے اور پھر کمشنر صاحب کے دفتر کے بابو۔ آپ کے یہاں کس چیز کی کمی" کوئی کہتا بھائی

بیٹی پرایا دھن ہے۔ زمانہ کھوٹا ہے۔ اس فرض سے تو جتنی جلد ممکن ہو سبکدوش ہو جانا چاہئے۔

تھوڑی دیر بعد جہیز کا سامان دروازہ پر لاکر رکھا گیا۔ کچھ کانا پھوسیاں کر رہے تھے۔ کچھ ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔ بعض زیر لب مسکرا رہے تھے اور بعض منہ پھٹ برملا کہہ رہے تھے ——————

"بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا"۔ صفدر جہیز کے سامان کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ تیس تولہ کے قریب طلائی اور دو سو تولہ کے لگ بھگ نقرئی زیورات۔ تانبے کے اور مراد آبادی برتن جو وزن میں تین من سے کم نہ ہوں گے۔ دو سو قیمتی ریشمیں اور زریں جوڑے مسہری۔ کرسیاں۔ مچھردانی۔ میز کم از کم دس ہزار کی لاگت کا سامان ہوگا اور عبداللہ خاں صاحب تھے کون ریلوے پولیس کے کنسٹبل مبلغ ۲۴ روپیہ ماہوار کے ملازم۔ پھر یہ سب کچھ کہاں سے آیا۔ یہ پوچھنے والا کوئی نہ تھا۔ اور ابھی انھیں تمام برادری کو کھانا بھی تو کھلانا تھا۔ دُلھن رخصت ہو گئی مگر گاؤں والوں کے سوالات نے صفدر کا پیچھا نہ چھوڑا "بھائی تم اپنی بیٹیوں کو کب تک بٹھائے رکھّو گے۔ خاندان میں اچھے لڑکوں کی کمی نہیں۔ تمہارے ممیرے بھائی کے ہی دو جوان لڑکے بیٹھے ہوئے ہیں"۔

صفدر حیران تھا کہ کیا جواب دے۔ وہ اپنی بیٹیوں کی شادی کرنے کی غرض ہی سے تو آیا تھا۔ اپنے ممیرے بھائی کے لڑکوں

کے ساتھ، مگر وہ تو سمجھے ہوئے تھا کہ دونوں لڑکیوں کی شادی میں زیادہ سے زیادہ پانچ چھ سو روپے خرچ ہو جائیں گے وہ کچھ رقم پراویڈنٹ فنڈ اور کچھ مسلم کو اپراینیٹو کریڈٹ سوسائٹی سے قرض لایا تھا۔ اُس کے پاس بچتا ہی کیا تھا۔ ستّر روپے ماہانہ کی تنخواہ اور سات نفر کھانے والے وہ تو چونکہ ۴۵ ۔ ۴۰ روپیہ ماہوار کا ٹیوشن کر لیا کرتا تھا گذر ہو جاتا تھا ورنہ ستر روپے اس زمانے میں سات آدمیوں پر مشتمل گھرانے کے لئے اونٹ کی ڈاڑھ کا زیرا بھی تو نہیں۔ وہ تو دس ہزار روپے تمام عمر میں نہ بچا سکتا تھا اور پھر اگر ہر لڑکی کو دس ہزار کا جہیز دے تو پانچ لڑکیوں کے لئے پچاس ہزار روپے کی رقم چاہیئے جو وہ اگر تمام عمر کچھ بھی نہ کھاتے اور کچھ نہ پہنتے تو بھی نہیں مہیا کر سکتا تھا۔

گھر آکر جب اس نے اپنی ماں سے جہیز کا حال بیان کیا تو بڑی بی نے حقارت سے کہا "کیا دیا۔ اونچی دوکان اور پھیکا پکوان ایک ہی تو بیٹی تھی۔ بڑی بڑی باتیں کیا کرتا تھا۔ پچھلے سال خیراتی حلال واچ مین نے اپنی بیٹی کو پچیس ہزار کا اور شیرانی خان دوکاندار نے اپنی بیٹی کو تیس ہزار کا جہیز دیا تھا"

صفدر نے کہا "اسلام ان خرافات کا حامی نہیں۔ حضور سرورِ کائنات نے اپنی چہیتی بیٹی کو صرف سوا روپیہ کی مالیت کا جہیز دیا تھا۔ کیا یہ شبراتی، خیراتی وحیدن اور مجیدن نعوذ باللہ حضور

اکرمؐ اور حضرت فاطمہؓ سے زیادہ ذی عزت ہیں۔

ماں نے کہا بیٹا "یہ سب کچھ سچ ہے مگر یہاں ان باتوں کو کوئی نہیں دیکھتا۔ مولوی عزیزالرحمٰن کیسے کیسے وعظ فرمایا کرتے تھے۔ مگر پچھلے سال اپنی بیٹی کی شادی میں ایسا جہیز دیا کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ وہ لوگ جنہوں نے تمام عمر تمہارے مرحوم باپؒ کی چلمیں بھری ہیں۔ دس دس ہزار روپے کا جہیز دیتے ہیں۔ تمہیں تو ان سے کہیں زیادہ دینا چاہیئے۔"

صفدر رات بھر بھیانک خواب دیکھتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ انسانی ڈھانچوں کی بنیاد پر بڑی بڑی عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ اور انسان ہی کے خون سے گارا تیار ہو رہا ہے — پھر دیکھا کہ دنیا میدان جنگ میں مبدل ہو گئی ہے۔ ٹینکوں سے گولیوں کی جگہ اشرفیاں نکلتی ہیں۔ لیکن ان کی چوٹ سے انسان برابر مر رہے ہیں۔ مرنے والوں کے جسم سے جو خون نکلتا ہے اس کی ہر بوند سے اشرفی تیار ہو جاتی ہے۔ گدھ جمع ہیں اور اپنی چونچوں میں ان اشرفیوں کو اٹھا اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔ وہ خود بھی اشرفیاں سمیٹ رہا ہے اور اس کا دامن اشرفیوں سے پُر ہے۔

مگر صبح جب آنکھ کھلی تو اس کی نگاہوں کا مرکزِ نقل اس کے بوسیدہ مکان کی کالی چھت تھی۔ اور اس کے کانوں میں ماں کے

یہ الفاظ گونج رہے تھے۔

"جنہوں نے تمام عمر تمہارے باپ کی چلمیں بھریں وہ تو دس دس ہزار روپیہ کا جہیز دیتے ہیں۔ تمہیں ان سے کچھ زیادہ ہی دینا چاہیئے"

لیکن دس ہزار کیا معنی وہ تمام عمر میں ایک ہزار بھی پس انداز نہ کر سکتا تھا۔

دوسرے روز صفدر معہ اہل و عیال ملازمت پر واپس چلا گیا۔ اس نے اپنے بہنوئی بھائی کو صورتِ حالات سے مطلع کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ دونوں لڑکوں کو اس کے مستقر پر بھیج دیا جائے۔ وہ اپنے مستقر پر ہی لڑکیوں کی شادی کر دیگا اور وہیں سے رخصت کر دے گا۔ مگر اس کی درخواست رد کی گئی۔

صفدر لڑکیوں کو دوسری جگہ نہ بیاہ سکتا تھا۔ اس کے خاندان میں ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ اس میں رسم و رواج کی ان زنجیروں کو توڑنے کی سکت نہ تھی جو مدت العمر سے اس کے آبا و اجداد سنبھالے چلے آرہے تھے۔

وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو یا نہ ہو قدرت اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئی۔

اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔

جب وہ دوسری بار اپنی ماں کے انتقال کی اطلاع پر وطن

گیا۔ تو اُس کے ہمراہ اُس کی بیوی اور صرف تین بیٹیاں تھیں۔ دونوں بڑی بیٹیوں کی شادی کے جاں گسل خیال سے قدرت نے اُسے سبکدوش کر دیا تھا۔ دونوں پہلے ہسٹریا اور پھر تپ دق میں مبتلا ہو کر دار البقا کو سدھار گئیں۔ تین باقی تھیں۔ قدرتاً میں صفدر کو ان کے جہیز کے جاں فرسا جناب سے بھی سبکدوش کرنے کی قدرت تھی اور شاید اس مرتبہ اِسی خیال کے سہارے پر وہ کچھ چونچال بھی تھا۔

سفارش

میٹرک کا امتحان دے کر گھر جانے پر میں نے اپنے گانوں میں ایک فٹ بال ٹیم کی بنیاد ڈالی تھی۔ ہم میں سے پانچ لڑکے تو اسکول اور کالج کے باقی گانوں کے اناڑی تھے۔ تیسرے سال جب میں اپنی ملازمت سے تین ماہ کی رخصت پر گیا تو یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ ہماری ٹیم کا ہر فرد اچھا کھلاڑی بن گیا ہے ہماری ٹیم نے قرب و جوار کے شہروں کی ٹیموں سے میچ کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ اور ہر کھیل میں اچھا مظاہرہ کرتی۔ ٹیم کے سنٹر فارورڈ کا نام بندرا بن تھا۔ یہ بے پناہ کھلاڑی تھا۔ اس کے پاس بال آجانے پر گول بن جانا یقینی تھا۔ یہ ذات کا چمار تھا۔

تین چار سال کی مسلسل پریکٹس کے بعد ٹیم نے بڑے

بڑے بڑے ٹورنامنٹوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ دہلی۔ لکھنؤ۔ جبلپور۔ جودھپور اور کئی ٹورنامنٹوں میں نامی گرامی ٹیموں کو ہراتی رہی۔ کئی ٹورنامنٹوں میں وِنر کا شیلڈ بھی حاصل کیا۔ ایک ٹورنامنٹ میں اسے ایرین اسپورٹنگ کلب رانچی سے فائنل میچ کھیلنا پڑا۔ ایرین اسپورٹنگ کلب کا شمار ہندوستان کی بہترین ٹیموں میں ہوتا تھا۔ ہماری ٹیم ایک گول سے ہار تو گئی مگر اس کا شو بہت اچھا رہا۔ بندرابن کا کھیل بیحد پسند کیا گیا۔ اسے تمام میچوں میں سب سے زیادہ اچھا کھیلنے کا تمغہ دیا گیا اور ہندوستان کے قریب قریب تمام اخبارات میں اس کی تعریف میں کالم کے کالم سیاہ ہوئے۔ اس ٹورنامنٹ کے چوتھے ہی ہفتہ میں ایرین اسپورٹنگ کلب کے ارباب حل و عقد نے بندرابن کو دو سو روپیہ ماہوار کے مشاہرے پر رانچی بلوالیا۔ یہاں پہونچکر بندرابن بہت چمکا وہ بہت ہی جلد عالمگیر شہرت کا کھلاڑی بن گیا۔ کوئی اخبار نہ تھا جس میں اس کا فوٹو نہ چھپتا ہو۔ لوگ ٹورنامنٹوں میں اس کا کھیل دیکھنے کے لئے دور دور سے آتے۔ اب بندرابن مسٹر بی۔ شمبیر ہو گیا تھا۔ شمبیر شاید چمار کی بگڑی ہوئی شکل ہو۔ مسٹر شمبیر اس عرصہ میں کبھی گاؤں نہ گئے تھے اور وہاں پران کا تھا بھی کون۔ باپ اُن کے پیدا ہونے کے دوسرے ہی مہینے آنجہانی ہو گیا تھا۔ بڑھیا بھی اس کے رانچی چلے جانے کے

دوسرے سال سدھار گئی۔ ع

خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

کا مقولہ ممکن ہے صحیح ہو مگر جب وطن میں پیٹ بھر روٹی نہ ملے اور اُٹھتے بیٹھتے گالیاں کھانی پڑیں ۔۔۔ دنیا بھر کی بیگار کرنی پڑے تو آپ ہی بتائیے وطن کو پردیس پر کوئی کیونکر ترجیح دے سکتا ہے مسٹر شمیر سب کچھ ہو جانے کے باوجود بھی گاؤں والوں کے لئے چمار ہی تھے۔ وہ تو اُس سے بیگار ہی لیتے اور اگر تعمیل حکم میں دیر ہوتی تو بے بھاؤ جوتے کھانے پڑتے۔ پھر وہ چمر ٹودھی کے علاوہ کہیں رہ بھی تو نہ سکتا تھا اور نہ کسی کنوئیں سے پانی بھر سکتا تھا نہ کسی کے برابر بیٹھ سکتا تھا۔

القصہ مسٹر شمر پردیس کے ہو رہے۔ گاؤں والے اس کی شہرت کے ذکر پر قہقہہ مار کر ہنستے اور کہتے کہ اگر وہ کبھی گاؤں میں آگیا تو اُس کا شمر پنا ایک گھڑی میں ٹھکانے لگا دیں گے۔

ایک سال مان بھوم رانا کپ ٹورنامنٹ میں ایرین ہیلو ہٹنگ کلب نے بھی شرکت کی۔ مسٹر شمر کو معلوم تھا کہ میں مان بھوم میں ہوں اور قاعدہ کے مطابق اُسے مجھ سے ملنے آنا چاہئے تھا۔ مگر انھوں نے ایسا نہ کیا اور چونکہ اب میں اور وہ دونوں شہری ہو چکے تھے جہاں شریف و رذیل کا امتیاز روا نہیں رکھا جاتا میں نے گاؤں کے آئین پر اڑے رہنا مناسب نہ جانا۔ مسٹر شمر سے ملنے کے لئے

ایرین اسپورٹنگ کلب کی قیام گاہ پر کئی مرتبہ گیا۔ مگر ہر مرتبہ یہی جواب ملا کہ مسٹر شمر کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ فیلڈ پر ملنا اس لئے آسان نہ تھا کہ ایرین اسپورٹنگ کلب کے میچ والے دن ٹرارش ہو جاتا تھا اور پولس کے انتظام کے باعث کوئی اپنی جگہ سے نقل و حرکت نہ کر سکتا تھا۔

ایک صبح جب میں مسٹر شمر کو شہر کے پارکوں میں تلاش کر کے مایوس واپس آ رہا تھا پیچھے سے کسی نے باآواز بلند مجھے پکارا۔ "مسٹر صمد مسٹر صمد"، مڑ کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ مس حق ہیں اور اُن کے ساتھ مسٹر شمر بھی ہیں مسٹر شمر کو دیکھتے ہی پہچان گیا حالانکہ اُن میں نمایاں تبدیلی ہو گئی تھی۔ وہ پہلے سے تندرست و توانا ہو گئے تھے۔ رنگ بھی نکھر آیا تھا۔ چہرے پر جوانی اور مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ قبل اس کے کہ میں پیشقدمی کروں وہ دونوں میرے پاس پہونچ گئے۔ مسٹر شمر نے مجھے یقیناً پہچان لیا ہوگا لیکن انجان بنے رہے۔ میں نے بڑھ کر گڈ مارننگ مسٹر شمر کہتے ہوئے ہاتھ بڑھائے طویل خموشی کے بعد مس حق بولیں "مسٹر صمد آپ شاید آج پہلی مرتبہ تفریح کے لئے نکلے ہیں"

"صحیح فرما رہی ہیں آپ" میں نے بالا پس و پیش کہا "مجھے سیر و تفریح کا وقت ہی نہیں ملتا محترمہ۔ دفتر۔ ٹیوشن۔ اور خامہ فرسائی آپ جانتی ہیں کتنی مصروف زندگی بسر کر رہا ہوں میں۔ آج تین

دِن سے البتہ بلاناغہ اِدھر آتا ہوں۔ در اصل آپ کے ساتھی مسٹر شمر میرے ہموطن ہیں اور ہم عرصہ تک ایک ساتھ کھیلتے رہتے ہیں۔ ان سے ملنے کو جی چاہتا تھا مگر یہ کیوں ملنے لگے بڑے آدمی ہیں"

مسٹر شمر نے بات کاٹ کر کہا "معاف فرمائیگا مسٹر صمد میں اس وقت تک آپ کو پہچان نہ سکا تھا۔ آپ تو بالکل ہی بدل گئے۔ یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔ بال بھی سفید کر لئے۔ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے"

مسٹر شمر بڑی اچھی انگریزی بول رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم انگریزی اُنھوں نے کب اور کہاں سیکھی۔

"مسٹر شمر ہموطن ہیں آپ کے" مس حق نے ارتجالاً پوچھا

"جی ہاں" میں نے کہا

مس حق ایک موڑ سے معذرت چاہنے کے بعد رخصت ہوگئیں اور میں اور مسٹر شمر ایرین کلب کی قیام گاہ پر پہونچ گئے۔ یہاں پہونچکر مسٹر شمر نے پوچھا "آپ مس حق کو کیسے اور کب سے جانتے ہیں"

"یہ یہاں کے ایک مشہور بیرسٹر کی صاحبزادی ہیں ٹینس کی چیمپین ہیں اور حسین بھی۔ بے نقاب حسین عورتوں کو کون جاننا پسند نہیں کرتا اور یہ تو یہاں کی بڑی مشہور عورت ہیں انھیں بھلا کیسے نہ جانتا۔ اور آپ اُنھیں کب سے جانتے ہیں" میں نے کہا۔

"معاف فرمائیگا بھائی ذرا بے تکلف ہو رہا ہوں، یہاں کون دیکھتا ہے۔ بھائی خدا کے لئے میرا پردہ رکھ لینا۔ میں اپنے آپ کو برہمن نژاد بتاتا ہوں۔ درصل مس جون مجھ سے محبت کرنے لگی ہیں اور میں بھی۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ مجھ سے سول میرج کرنا چاہتی ہیں" مسٹر شمر نے کہا۔

"بسم اللہ" میں نے کہا "تم اطمینان رکھو میں کسی سے راز افشا نہ کروں گا مگر بھائی شادی کے بعد تمہیں ایرین کلب والے ملازم کب رہنے دیں گے"

میں نے کہا

"اُنہ یہ ضروری نہیں کہ اس کلب کا ہر ممبر غیر شادی شدہ ہی ہو" مسٹر شمر نے کہا۔

بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد مسٹر شمر سے گھر آنے کا وعدہ لے کر میں چلا آیا۔

مسٹر شمر سے میری دوسری ملاقات اُس وقت ہوئی جب وہ سول میرج کے بعد کسی میچ میں داہنا پاؤں بیکار ہو جانے کے باعث کلب سے الگ کر دیئے گئے تھے۔ اور رانچی میں ملازمت تلاش کر رہے تھے۔ اُن کے پاس تین چار ہزار روپیہ تھا۔ مسٹر شمر بیحد فضول خرچ تھے ورنہ وہ چاہتے تو لاکھوں بچا لیتے اس لئے کہ کلب کی تنخواہ کے علاوہ اُنھیں وقتاً فوقتاً سیٹھوں کی طرف سے

بڑے بڑے انعامات بھی ملتے رہے تھے۔ وہ ان دنوں کچھ پریشان نظر آتے تھے ــــ ایک روز مجھ سے پوچھنے لگے۔

"چیف صاحب کیسے آدمی ہیں"

"بہت اچھے" میں نے کہا

"میرا مقصد یہ تھا کہ کسی کی سفارش سنتے ہیں کہ نہیں" مسٹر شمر نے پوچھا "کیوں نہیں" میں نے کہا اور آج کون سا افسر ہے جو سفارش نہ مانتا ہو۔ آج کل سفارش ہی سب سے بڑی کوالیفکیشن ہے۔ قابلیت کو کون دیکھتا ہے" میں نے کہا

"میں نے سنا ہے کہ عورتوں کی سفارش زیادہ مانتے ہیں" مسٹر شمر نے کہا

"یہ تو نہیں عرض کر سکتا البتہ میں نے یہ ضرور دیکھا ہے کہ ان کے ہمراہ ان کی کار پر شہر کی نوجوان حسین عورتوں کا جمگھٹا رہتا ہے وہ اس ضمن میں شہر میں اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے" میں نے کہا۔

اتوار کا دن تھا۔ ساون کا مہینہ۔ آسمان پر شفق کھل رہی تھی۔ سبزہ مہک رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں پیڑوں پر پرندے چہک رہے تھے اور ہماری پارٹی شکار سے واپس آ رہی تھی۔ میں ساتھیوں سے الگ ہو کر ایک جنگلی مرغی کا پیچھا کرتے ہوئے دور نکل گیا۔ ایک سرسبز جھاڑی کی اوٹ میں ایک چٹان پر سستانے لگا

مسز شمر چیف صاحب سے مصروف اختلاط تھیں بیں دبے پاؤں واپس آ گیا۔

- اب تو اکثر مسز شمر (سابق مس حق) چیف صاحب کی کار میں بیٹھی نظر آئیں۔ ادھر مسٹر شمر کنٹرول کے انسپکٹر بھی بن گئے تھے۔ اور تین چار ماہ کے اندر ہی اندر ترقی کرتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ آف اسٹور بن گئے اُن کے پاس بنگلہ۔ خانساما ۔ ریڈیو۔ بیرا غرضکہ وہ سب کچھ بنے جو آجکل کے بڑے آدمیوں کے پاس ہوتا ہے البتہ بیوی آپ ان کی نہ رہی بلکہ ایک ملکیت عام بن گئی۔ مسٹر شمر نے اس خیال سے کہ شاید ان کی بیوی کے دل میں کچھ اپنے مذہب کی محبت ہو۔ خود اسلام قبول کر لیا۔ مگر یہ مسٹر شمر کی غلطی تھی کیونکہ مس حق کا کوئی مذہب نہ تھا اگر تھا تو روپیہ اور عیاشی تھا۔ مسٹر شمر مسلمان بنے رہ گئے مگر نام نہاد مسلمان والدین کی بیٹی مس حق بےدین کی بےدین رہیں — ہاں عیاشی انکا سب سے بڑا مذہب تھا۔

———۔✲ (✲) ✲۔———

جمالِ ہم نشیں

منشی کرامت بیگ صاحب میرے پڑوسی تھے۔ دن بھر ریلوے ورکشاپ میں کام کرنے اور شام کو محلہ کے بچوں کو قرآن پڑھانے اہل محلہ میں اُن کی بڑی آؤ بھگت تھی ہر مذہبی مسئلہ میں منشی جی سے استصواب ضروری سمجھا جاتا۔ چالیس کے لگ بھگ تھے مگر جوان نظر آتے۔ البتہ داڑھی کے بالوں میں کہیں کہیں سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ سفید بالوں کو وہ مہندی کے ذریعہ ارغوانی کر لیتے تھے ۔۔۔ روزہ نماز کی سختی سے پابندی کرتے اور اہل محلہ کو ہمہ وقت شعائر اسلامیہ کی پابندی کی تلقین فرماتے رہتے۔ لیکن میرے بے نمازی ہوتے ہوئے بھی مجھ پر مہربان تھے شاید ہموطنیت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر۔

منشی جی کے دو لڑکیاں تھیں جو مجھے چاچا کہہ کر پکارتیں اور جب

کبھی منشی جی کے یہاں کوئی اچھی چیز پکتی اس میں میرا حصہ ضرور لگتا۔
ماماؤں کی اسٹرائک سے میں کچھ عرصہ سے دستِ خود دہانِ خود کے مقولہ پر عمل پیرا ہو گیا تھا۔ایک روز منشی جی نے اصرار کر کے میرے کھانے کا انتظام اپنے گھر پر کر دیا۔

بھابھی صاحبہ دونوں وقت پابندیٔ وقت کے ساتھ مجھے کھانا بھجوا دیتیں۔منشی جی کی دونوں بچیاں مجھ سے بے حد مانوس تھیں اور مجھے بھی اُن سے اُنس ہو گیا تھا۔میں میلوں ٹھیلوں سے اُن کے لئے کھلونے۔چاٹ۔کلپیں اور چوٹی کنگھی لا دیا کرتا۔یہ سلسلہ سال بھر تک قایم رہا اور مجھے منشی جی یا بھابھی صاحبہ سے کبھی کسی قسم کی شکایت پیدا نہ ہوئی۔میں اِن دونوں کو بہترین قسم کے انسان سمجھتا تھا۔بھابھی صاحبہ کا پردہ مجھ سے ٹوٹ چکا تھا۔وہ منشی جی سے عمر میں کچھ زیادہ معلوم ہوتی تھیں اُن کے خدوخال بتا رہے تھے کہ وہ جوانی میں یقیناً قبول صورت ہونگی۔لیکن امتدادِ زمانہ نے اب اُن میں نام کو جاذبیت نہ باقی رکھی تھی۔

ایک روز منشی جی نے مجھ سے ماحول کی بُرائی اور تنگیٔ مکان کی شکایت کرتے ہوئے شہر میں مکان لینے کا قصد ظاہر کیا۔کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اُن کی رائے سے اتفاق نہ کرتا۔دو ہفتہ کے اندر اندر وہ شہر کے کسی محلے میں منتقل ہو گئے۔میں نے کھانے کی تکلیف کے پیشِ نظر اہلیہ کو بلوا لیا اور چند روز خانگی خرخشوں میں ایسا اُلجھ کر رہ گیا کہ

منشی جی اور بھابھی صاحبہ سے اُن کے نئے مکان پر نہ مل سکا۔
منشی جی کے محلہ چھوڑ جانے کے کافی عرصہ کے بعد ایک روز میں سو کر اُٹھا ہی تھا کہ بیگم نے بتایا کہ کوئی محترمہ بڑی دیر سے میرا انتظار کر رہی ہیں۔ یہ بھابھی صاحبہ تھیں۔ اُن کے بشرے سے سراسیمگی برس رہی تھی دریافت حال پر اُنھوں نے بادیدۂ نم بتایا کہ منشی جی نے اُنھیں طلاق دیدی ہے اور کسی دوسری عورت سے نکاح کرنے کا قصد رکھتے ہیں۔ منت وسماجت کے باوجود بھی لڑکیاں بھابھی صاحبہ سے چھین لی گئی ہیں اور اُنھیں فوراً گھر چھوڑ دینے کا حکم دیدیا گیا ہے۔ طویل سکوت کے بعد میں نے پوچھا

"کون ہے وہ عورت"

"ہماری پڑوسن ایک بسکٹ والے کی بیوی"

"کیا عمر ہوگی اس کی" میں نے پوچھا

"یہی ۲۲-۲۳ سال کی" بھابھی صاحبہ نے جواب دیا

"اور شکل و صورت"

"قبول صورت ہے" بھابھی صاحبہ بولیں۔

"بسکٹ والے نے اُسے طلاق دیدی ہے" میں نے پوچھا

"ابھی طلاق تو نہیں دی مگر طلاق ہو جائے گی۔ وہ طلاق دینے کے صلہ میں آپ کے بھائی صاحب سے ایک ہزار روپیہ طلب کر رہا ہے آبرو باختہ ہے مُوا۔ یہ عورت جہاں تک میرا خیال ہے اُس کی بیاہتا

بیوی نہیں۔ آوارہ معلوم ہوتی ہے" بھابھی صاحبہ نے کہا
"منشی جی بسکٹ والے کو ایک ہزار روپیہ دے سکیں گے" میں نے پوچھا
"کیوں نہیں۔ میرا تمام زیور انھیں کے پاس تو ہے۔ آج کے بھاؤ سے میرا زیور دو ہزار سے کم کا نہ ہوگا"
"یہ زیور منشی جی نے بنوایا تھا" میں نے پوچھا
"نہیں میرے والدین نے دیا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ آپ کے بھائی صاحب نے مجھ سے شادی ہی جہیز کے لالچ سے کی تھی" بھابھی بولیں۔
"اچھا تو کچھ مضائقہ نہیں۔ میرا غریب خانہ حاضر ہے۔ رہا بچیوں کا سوال تو میرا خیال ہے ان کا منشی جی کے پاس رہنا ہی زیادہ مناسب ہے" ——— میں نے کہا

بھابھی صاحبہ میرے یہاں صرف تین دن رہیں۔ اس کے بعد اپنے بھائی سے ملنے کے بہانے سے کانپور چلی گئیں۔ چلتے وقت میں نے اُن کی خدمت میں پچاس روپئے کی حقیر رقم پیش کی۔

بھابھی صاحبہ نے اپنی رسید کا خط تک نہ بھیجا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک ملنے والے کی زبانی معلوم ہوا کہ منشی جی کا نکاح بسکٹ والے کی بیوی سے ہوگیا ہے اور دونوں خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں اور یہ کہ نئی بیوی کا برتاؤ لڑکیوں سے بیحد اچھا ہے۔ بارہا جی چاہا کہ منشی جی سے ملوں مگر اس خیال نے کہ شاید وہ مجھ سے مل کر خوش نہ ہو سکیں معذور رکھا۔

ایک روز مجھے ایک عزیز کا خط ملا جس میں اُنھوں نے اپنے لڑکے کے لئے کسی اچھی لڑکی سے نسبت کا خیال ظاہر فرماتے ہوئے اس معاملہ میں میری اعانت چاہی تھی۔ بہت غور وخوض کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ منشی جی کی بڑی لڑکی عائشہ کے لئے بات چیت کی جائے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میں نے منشی جی سے ملنے کا تہیہ کر لیا۔

منشی جی نے اس عرصہ میں خدا جانے کتنے مکانات اور محلّے بدل ڈالے تھے۔ بڑی مشکل سے اُن کے مکان کا پتہ معلوم ہوا۔ ایک اتوار کو صبح میں اُس محلّہ میں جہاں منشی جی کا گھر بتلایا گیا تھا پہونچا۔ محلّہ والوں سے پوچھنے پر گھر تو مل گیا مگر منشی جی نہ ملے۔ منشی جی کے گھر پر میں نے متعدد دستکیں دیں مگر جواب نہ ملا۔ اتفاق سے اس محلّہ میں میرے ایک جان پہچان والے رہتے تھے وہ مجھے دیکھ کر میرے پاس آ گئے۔ دریافت پر اُنھوں نے فرمایا۔

"منشی جی گھر پر تو ہوں گے مگر ملیں گے نہیں"

"کیوں" میں نے پوچھا

"وہ آج کل کسی سے نہیں ملتے حتّٰی کہ پڑوسیوں سے بھی۔ دن رات اوراد و وظائف میں منہمک رہتے ہیں۔ دونوں وقت درگاہ سے لنگر مل ہی جاتا ہے"

"اور ملازمت" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ایک زمانہ ہوا ملازمت سے برطرف کر دئے گئے" اُنھوں نے کہا

"اور بیوی بچے" میں نے پوچھا

"وہ بھی عرصہ ہوا غائب ہو گئے" اُنھوں نے کہا۔

"کیا مقصد" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"پہلی بیوی کو تو زمانہ ہوا منشی جی نے طلاق دیدی تھی۔ اب وہ کہاں ہے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

دوسری بیوی منشی جی کو طلاق دے گئی"

"طلاق دے گئی کیا معنی"

"منشی جی کارخانہ ہی میں تھے کہ وہ کسی کے ساتھ فرار ہو گئی"

"اور منشی جی کی دونوں لڑکیاں"

"وہ بھی یکے بعد دیگرے اپنے اپنے آشناؤں کے ساتھ فرار ہو گئیں" اُنھوں نے کہا

"سچ کہتے ہو؟ وہ تو بڑی شریف بچیاں تھیں" میں نے کہا۔

"یقیناً وہ شریف ہونگی۔ مگر جمال ہمنشیں در من اثر کرد۔ جو کسی نے کہا ہے۔ منشی جی کی دوسری بیوی پرلے درجہ کی اوباش تھی۔ محلہ کا کوئی ہی نوجوان بچا ہوگا جس پر اُس نے ڈورے نہ ڈالے ہوں۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔ بزرگوں کا مقولہ ہے۔ دونوں لڑکیاں بھی اسی کے نقش قدم پر چلنے لگیں۔ منشی جی دن بھر کارخانہ میں لوہا کوٹتے رہتے اور منشیانی جی گھر پر دادِ عیش دیتیں۔ منشیانی جی کے چاہنے والے

بہت جلد اُن سے سیر ہو گئے۔ مرد ہری چگ ہوتا ہی ہے اُنھوں نے لڑکیوں کی طرف ہاتھ بڑھانا شروع کیا اور منشیانی جی نے اپنی گرم بازاری کو برقرار رکھنے کے لئے رشوت دینی شروع کردی۔ رشوت میں دونوں لڑکیاں باری باری پیش ہونے لگیں سچ کہا ہے آدمی کا شیطان آدمی ہوتا ہے آخر ناتجربہ کار ہی تو تھیں پہلے منشیانی جی اور اُن کے تھوڑے ہی عرصہ بعد دونوں لڑکیاں غائب ہو گئیں۔ دراصل یہ منشی جی کی کمزوری تھی۔ انھیں اپنی محترمہ کے لچھنوں کا علم ہو چکا تھا مگر یہ تو ایسے ریجھے کہ سنی کی ان سنی کرتے رہے اور اب پچھتائے کیا ہوت ہے۔ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"

اس واقعہ سے مجھے بیحد تکلیف ہوئی اور بادلِ غمگین گھر واپس آگیا

———— ✲ (✲) ✲ ————

اندھیر نگری

ندیم نے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا لیکن باپ کے اچانک انتقال
کر جانے کے باعث تمام کُنبے کا بار اُس کے نازک کندھوں پر پڑ گیا اور اس
طرح وہ سلسلۂ تعلیم منقطع کرنے کے ساتھ ساتھ تلاشِ ملازمت کے لئے مجبور
ہو گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ کہیں نہ کہیں اُسے ملازمت مِل جائے گی مگر ایسا نہ ہوا
اور اس زمانہ میں سفارش بغیر کسی محکمہ میں جگہ مل جانا کوئی آسان کام بھی تو نہیں
ندیم کی ضروریاتِ زندگی بیحد مختصر تھیں۔ وہ خواجہ صاحب کے درگاہ
کے لنگر پر اکتفا کرتا۔ وہیں سو جاتا۔ چائے پان بیڑی کا اُسے مطلق شوق
نہ تھا۔ ہفتے کے ہفتے آنا ساگر میں غسل کرنا اور وہیں سے کپڑے دھو لانا۔
وہ گزر کے لئے ٹیوشن بھی کر سکتا تھا لیکن اُسے اجمیر میں میرے سوا کوئی
نہ جانتا تھا اور ٹیوشن بغیر تعلقات نہیں ملا کرتے۔ مَیں نے بہت چاہا کہ جبتک

وہ ملازم نہ ہوجائے دونوں وقت میرے یہاں کھالیا کرے مگر اُس نے اسے قبول نہ کیا وہ ہفتہ میں دو ایک مرتبہ مجھے ضرور ملا کرتا۔

اُس کی گفتگو سے میں نے بہت جلد اندازہ لگا لیا کہ اگر اُس پر ایک بڑے کنبے کا بار نہ ہوتا تو وہ تارک الدنیا ہوجاتا یا پھر ملک و قوم کی خدمت کو اپنا نصب العین بناتا۔ اُس میں ایک اچھے لیڈر بننے کی صلاحیت موجود تھی۔ وہ بڑی خوبی سے اپنا مافی الضمیر ادا کرسکتا تھا۔ کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر وہ بے تکلف اور متبحرانہ گفتگو نہ کرسکتا ہو۔ اُردو اور انگریزی کے علاوہ وہ فارسی اور عربی میں بھی کافی دستگاہ رکھتا تھا اور یہ چیز اُسے خاندانی ورثہ کے طور پر ملی تھی۔ اُس کے خاندان میں اچھے اچھے عالم ہیں خود اُس کے والد ایک جیّد عالم تھے۔

ندیم کی ملازمت کے سلسلے میں میں نے بھی کوشش کی مگر ہر جگہ سے یہی جواب ملتا رہا "فی الحال کوئی جگہ خالی نہیں ہے" یا دو ایک جگہ نام رجسٹرڈ ہوگیا مگر پھر کوئی جواب نہ آیا۔

ایک روز ندیم جب مجھ سے ملنے کے لئے آیا خلاف معمول پریشان تھا اس دن اس کا موضوع مبحث زیادہ تر درگاہ خواجہ کی تولیت اور وقف کا مسئلہ رہا۔ اُس نے دبی زبان سے کہا "ہم لوگوں سے تو خواجہ کے خادم ہی اچھے ہیں"

"مسٹر ندیم خدا کا شکر ادا کیجیے کہ آپ ایک اعلیٰ خاندان میں پیدا ہوئے خاندانی نجابت گو دنیاوی اعزاز میں بڑی اہمیت حاصل ہے" میں نے کہا

ڈسبیٹنگ۔ مگر اُسی وقت جب حبیب اور پیٹ دونوں پر ہوں مفلس کا کوئی خاندان ہے نہ مذہب" ندیم نے جھنجھلا کر جواب دیا آج ندیم کی گفتگو سے پراگندہ خیالی کی بو آرہی تھی۔ اُس کے عزائم میں تزلزل پیدا ہو چکا تھا۔ پہلے کی طرح آج وہ زیادہ دیر نہ بیٹھا اور ایک طویل معانقہ کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ ہفتے اور مہینے گزرتے گئے مگر ندیم صاحب نہ آئے میں نے دو چار دفعہ درگاہ کے حجروں میں بھی اُنھیں تلاش کیا مگر کہیں پتہ نہ چلا اور اس خیال سے کہ شاید بیکاری سے تنگ آکر وہ بلا اطلاع وطن چلے گئے ہوں گے مطمئن ہو گیا مرور ایام کے ساتھ ساتھ ندیم اور ندیم کا خیال میرے دل سے محو ہو گئے۔

ایک دن بیگم مجھے پڑ گئیں کہ تلو شریف کی زیارت کے لئے رخصت حاصل کی جائے۔

تلو مضافات اجمیر میں ایک چھوٹا سا قریہ ہے۔ اس کے نام میں شریف کا اضافہ حال ہی میں ہوا ہے کوئی بزرگ جنھیں عوام میں حاجی بابا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے حال ہی میں وہاں دفن ہوئے ہیں۔ ایک دن گاؤں کے کسی اہیر کی گائے کھو گئی اُس نے حاجی بابا کے مزار پر منت مانی اور گائے مل گئی۔ اُس کے بعد سے گاؤں والے ذرا ذرا سی باتوں پر حاجی بابا کے مزار پر منتیں ماننے لگے اور منتیں پوری بھی ہوتی رہیں — شدہ شدہ حاجی بابا کے مزار کے برکات و فضائل کا شہرہ اطراف و اکناف

میں پھیل گیا اور زائرین جوق در جوق نلّو شریف آنے لگے شروع شروع تو یہ عالم تھا کہ ہر جمعرات پر ریلوے کو دو دو اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کرنا پڑتا۔ مزار کے قریب والے حوض کے پانی کی یہ تاثیر بتائی جاتی تھی کہ اگر اندھا اُس سے آنکھیں دھولے تو بینا ہو جائے اور جیسا کہ حاجی بابا کی سوانحعمریوں میں تحریر تھا ہزاروں نابینا بینا ہو چکے تھے۔ حاجی بابا کے مزار کی خاک سے ہر قسم کے مرض والوں کو فائدہ پہونچتا تھا۔ نلّو ریاست کشن گڈھ کا قریہ ہے۔ کشن گڈھ دربار نے مزار کو پختہ کرانے کے ساتھ ساتھ قرب و جوار میں زائرین کی سہولت کے لئے بہت سے مکانات بھی تعمیر کرا دئے اجمیر میں آجکل ہر فقیر حاجی بابا کی منقبت کی غزلیں گا گا کر بھیک مانگا کرتا ہے۔

بیگم صاحبہ کا اصرار غالب آیا اور ہم بھی ایک روز نلّو شریف جا پہونچے —— زائرین کا کافی ہجوم تھا۔ درگاہ کے سامنے قوالوں کی تین چار ٹولیاں حاجی بابا کی منقبتیں گا رہی تھیں۔ چاروں طرف سے روپئے برس رہے تھے۔ کچھ بزرگ صورت انسانوں پر حالی طاری تھا ایک طرف ایک بھاری بھرکم بزرگ جن کے چہرۂ مبارک پر بڑی گھنی داڑھی تھی زنانہ لباس میں ملبوس۔ دھانی چوڑیاں اور رناگ میں بُلاق پہنے ہوئے ناچ رہے تھے۔ یہ سدا سہاگ بابا تھے۔ بیگم صاحبہ کو ایک درخت کے سایہ میں بٹھا کر میں فاتحہ خوانی کی غرض سے مزار کے اندرونی حصہ میں داخل ہو گیا۔

مزار کے پہلو میں چند مجاورین کے جھرمٹ میں ایک کافر جوانی ایستادہ تھی۔ کاکل بدوش۔ ریشمیں گیروے تہبند اور کرتے میں ملبوس آنکھوں میں ملائک فریب خمار کروٹیں لے رہا تھا۔ مجاور آ سے مزار کی اگربتیوں کی دھونی دے رہے تھے اور وہ بری طرح چیخ رہی تھی "مری مری مر گئی۔ خدا کے لئے بچاؤ۔ اب نہ آؤں گی۔ جاتی ہوں کبھی نہ آؤں گی حضرت سلیمان کی قسم وغیرہ وغیرہ"

معلوم ہوا کہ وہ آسیب زدہ تھی۔ میں جہاں کا تہاں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بزرگ جبہ و قبہ بر دوش عمامہ بر سر اور ہزارہ تسبیح بر کف تشریف لائے۔ اُن کے دائیں بائیں کئی مجاور بھی تھے میں نے اُنھیں پہلی ہی نظر میں پہچان لیا اور شاید اُنھوں نے مجھے بھی۔ یہ نوابزادے ندیم صاحب تھے۔

اُنھوں نے مجھے اشارے سے ایک طرف بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ مجھے ایک جگہ بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ایک مجاور نے آ کر کہا "قبلہ سجادہ نشین صاحب نے آپ کو یاد فرمایا ہے"

بہت بہتر کہہ کر میں اس کے ہمراہ ہو گیا۔

میں مسٹر ندیم کہہ کر لپٹ گیا۔ اُنھوں نے مجاور کو اشارے سے باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ اور کمرے میں صرف میں اور ندیم رہ گئے کمرہ بے حد پُر تکلف طور پر آراستہ و پیراستہ تھا۔ قالین۔ صوفے۔ بڑی بڑی الماریاں۔ آرام کرسیاں۔ میز۔ مسہری۔ ظروف۔ غرضکہ اپ ٹو ڈیٹ

"بیگم صاحبہ میرے ہمراہ ہیں"، میں نے کہا۔

"بہت خوب تو لائیے نہ انھیں بھی۔ اب میں آپ لوگوں کو اجمیر عرصہ تک نہ جانے دونگا۔ چھٹی کا بندوبست کر لیجئے" ندیم نے کہا۔

ہم نے پوری چھٹی وہیں گزاری۔ اور خوب خوب دعوتیں اُڑائیں اب ہمارے ندیم صاحب رئیس ہو گئے تھے۔ ریاست نے درگاہ کے مصارف کے لئے تین گاؤں وقف کر دئے تھے اور ندیم صاحب درگاہ کے سجادہ نشین اور وقف کے ناظم تھے۔

"یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے تم نے" میں نے پوچھا

"اندھیر نگری چوپٹ راج۔ دولت کماؤ مکر سے روٹی کھاؤ گھی شکر سے" ندیم نے مسکراتے ہوئے کہا

"آخر یہ مزار کن بزرگ کا ہے" میں نے پوچھا

"یار ایک لاوارث فقیر کو لا کر گاڑ دیا تھا" ندیم نے کہا۔

———— ❊ ————

بہروپئے

"السلام علیکم حضرت مصلح قوم۔ کہاں سے نزولؔ ہو رہے ہیں سرکار اس بھری برسات میں"

نعیم نے پیچھے سے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

نعیم مجھے حضرت مصلح قوم ہی کہا کرتا ہے۔ قبل اس کے کہ میں جواب دوں اس نے حسب عادت میری جیبوں کی تلاشی لینی شروع کر دی۔

"جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" کہتا ہوا میں قریبی چائے کی دوکان میں گھس گیا اور ساتھ ساتھ نعیم بھی۔

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی نعیم پر موعظت کا دورہ پڑا اور قبل اس کے کہ چائے آتے آپ نے ایک دھواں دھار تقریر کر ڈالی۔

"میں نے ہزار مرتبہ کہا ہوگا کہ کچھ نہیں رکھا ہے اس مشاعرہ بازی میں

لیکن آپ کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ شعر و سخن کا مشغلہ اس میں ذرا بھی شک نہیں غم رُبا ہونے کے ساتھ ساتھ بے ضرر بھی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ اس دور کے بہترین شاعر ہیں مگر معاف فرمائیے شاعرہ بازی تو کسی حیثیت سے اچھی چیز نہیں۔ رات رات بھر جاگنا۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانا۔ سر دھن دھن کر داد دینا کہاں کی انسانیت ہے اور پھر ایک روز کی مصیبت ہو۔ جب دیکھو مشاعرہ۔ جہاں دیکھو مشاعرہ۔ اِس روزروز کی شب زندہ داری کا آخر کوئی معاوضہ بھی تو ہو جو چار جوتے میں ایک کیل ٹھونکنے کے ۲ر رکھوا لے رنڈی ایک غزل گا کر پانچ روپئے وصول کر لے وکیل، عدالت تک قدم رنجہ فرمانے کے سیکڑوں رکھوا لے اور آپ رات بھر گلا پھاڑ پھاڑ کر چلائیں اور صبح کو موچی کے موچی —— پھر لطف یہ کہ آسی کلام کو جس کا صلہ خالی پیلی واہ واہ لفظی پڑھ کر لوگ بی۔ اے اور آئی۔ سی ایس کی ڈگری حاصل کریں۔ کوئی تُک بھی ہو"

میں نے چائے کی پیالی تھامتے ہوئے کہا" بھائی میں تو ایک جلسے سے آ رہا ہوں مشاعرہ سے نہیں۔ برسات کی وجہ سے آجکل مشاعرے ہو ہی کہاں رہے ہیں"

نعیم پھر چہکا" یک نہ شد دو شد۔ کیا رکھا ہے برادرم ان باتوں میں شغلِ بیکاراں ہے یہ۔ آپ تو وہ کام کیجئے جس سے آپ کی آمدنی میں اضافہ ہو تاکہ بیگم کو عزت کے کپڑے میسر آسکیں اور بچوں کی خاطر خواہ تعلیم ہو جائے کیا نتیجہ ہے ان لغویات کا اور پھر کوئی تقریب بھی ہو۔ یہ بھاڑے کے ٹٹو اپنے

ضمیر کے خلاف گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے پھرتے ہیں۔ ابھی ایک صاحب کہہ
رہے تھے زمین گول ہے تھوڑی دیر بعد دوسرے صاحب فرما رہے ہیں
زمین مستوی ہے — دل لگتی بات ہو تو کوئی سنے بھی اور اس پر عمل بھی
کرے جتنے منہ اتنی باتیں۔ یہ ہندوستان ہے ہندوستان غلاموں کا
ملک۔ حضرت مصلح قوم صاحب غلام کی ہر چیز پر غلامی کی مہر ثبت ہوتی
ہے۔ نہ ضمیر اس کا نہ زبان اس کی — اور حق تو یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو
کچھ نہیں بن سکتا اور نہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے جھٹ سے لیڈر۔
شاعر یا ایڈیٹر بن جاتا ہے اور اس میں خرچ بھی کیا ہوتا ہے ان پیشوں
کے لئے — بیٹھے ہی تو ہیں یہ اگر کوئی سند مقرر کر دی جائے تو آپ دیکھیں
گے کتنی جلدی یہ بادی چھٹ جاتی ہے — آج تو جدھر دیکھو لیڈر
یہاں دیکھو شاعر۔ مجھے تسلیم کہ ریفارمر کی ہر جگہ ہر زمانہ اور ہر دور میں ضرورت ہے
مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ سب کے عقائد۔ نصب العین اور مطمح نظر میں
اختلاف۔ اور طرز تمدن و معاشرت میں تباین۔ پھر اصلاح کا مفہوم کیونکر
متعین کیا جا سکتا ہے۔ ایک کے یہاں جو چیز مذہباً جائز ہے دوسرے
کے یہاں ناجائز۔ ہندوستان میں کسی بھی تحریک کے پروان نہ چڑھنے کا یہی
سبب تو ہے کہ در اصل ہمارا کوئی نصب العین ہی نہیں۔ جو جی میں آیا کیا اور
جو منہ میں آیا بک دیا۔ پھر اصلاح کے مدعی کا کوئی ونلا بھی تو ہو۔ وہ شخص جو
خود محتاجِ اصلاح ہو یا جو اپنے متعلقین کی اصلاح سے غافل تمام ملک
یا دنیا کی اصلاح کیونکر کر سکتا ہے اور اسے کیا حق حاصل ہے کہ وہ دوسروں

کی اصلاح کا بیڑا اٹھائے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ اپنے اپنے گھر کے سامنے جھاڑو لگاؤ تمام گالوں صاف ہوجائیگا۔ میرے خیال میں لیکچر دیتے رہنے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ انسان خود اپنی اصلاح کی طرف رجوع ہو۔ اُسے اتنی مختصر عمر ملی ہے کہ وہ اپنی ہی اصلاح مشکل سے کرسکتا ہے اور اگر خوش قسمتی سے اپنی اصلاح سے اُسے فراغت حاصل ہوجائے تو اپنے متعلقین کی اصلاح کی طرف مائل ہو پھر محلہ، شہر، تحصیل وغیرہ کی اصلاح کرے۔ حالانکہ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ مصلح بنتا نہیں ہے بلکہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پیغمبروں کی بعثت کا سلسلہ قائم کیا جاتا آپ نے کبھی اپنے نام نہاد لیڈروں سے یہ بھی پوچھا کہ وہ جس چیز کی تلقین کر رہے ہیں اس پر وہ خود بھی عمل پیرا ہیں کہ نہیں۔ حالت تو یہ ہے کہ لیڈر صاحب شارع عام پر گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے ہیں اور اُن کی گھر والی دوسروں کے ساتھ داد عیش دے رہی ہے۔ تو ہاں آج کن مہاشے کا لیکچر تھا"

میں نے نعیم کے لیکچر سے تنگ آکر اختصار سے کام لیتے ہوئے کہا

"مسٹر پرکاش کا مسز پرکاش نے بھی تقریر کی تھی۔ دونوں بلا کے نقار ہیں"

"موضوع کیا تھا" نعیم نے پوچھا

"عصمت اور خاتون مشرق"، میں نے کہا

"خوب مسٹر پرکاش اور مسز پرکاش اور خاتون مشرق کی عصمت پر لیکچر ملعون کہیں کے"، نعیم نے غصے سے لال ہوکر کہا۔

"تم تو تمام دنیا کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہو" میں نے کہا

"میں سچ کہہ رہا ہوں کہ یہ لوگ عصمت کے معنی سے بھی آگاہ نہیں" نعیم نے کہا

"ثبوت" میں بولا

"کبھی پیش کر دیا جائیگا" نعیم نے کہا

ایک تعطیل کے روز میں سو کر اُٹھا ہی تھا اور پلنگ پر بیٹھا ہوا ریڈیو سے بلند ہونے والے نغموں "چھا رہی کالی گھٹا جیا مورا لہرا سے ہے" کا دل ہی دل میں لطف اُٹھا رہا تھا کہ نعیم کے ملازم نے لا کر ایک رقعہ دیا

"محترمی! آج شام کو ۵ بجے چشمے پر ملئے۔ چائے وہیں پی جائے گی میرے ساتھ اور بھی احباب ہوں گے یو پی کے ایک خوش فکر شاعر بھی آ گئے ہیں وہ بھی ہمراہ ہوں گے وقت کا لحاظ رہے۔ عدم شرکت ملال کی موجب ہو گی والسلام آپکا نعیم"

میں نے بلا تامل دعوت قبول کر لی اور ایک رقعہ کے ذریعہ نعیم کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دیا۔

میں وقت مقررہ پر چشمہ پہونچ گیا۔ بڑا جنوں انگیز موسم تھا کائنات سبز بانات میں ملفوف تھی۔ بادل فضا میں مست ہاتھیوں کی طرح آوارہ تھے۔ پرند سر سبز جھاڑیوں میں چہچہا رہے تھے۔ اور جھرنا عجیب

دِلربایانہ انداز سے اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ چشمہ کے قریب جاکر میں نے دیکھا کہ ایک چٹان پر مسٹر نعیم اور مسز پرکاش دراز ہیں۔ مسز پرکاش کا سر نعیم کے زانو پر ہے اور نعیم کی انگلیاں مسز پرکاش کی سنبلیں زلفوں سے کھیل رہی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی مسز پرکاش کسمسا کر اُٹھ بیٹھیں مگر نعیم اُسی طرح لیٹا رہا۔

سلام کے جواب میں نعیم نے مسکرا کر کہا "آیئے حضرت مصلح قوم"
میری گردن ندامت سے جھک گئی

کانٹا

کھچڑی ٹھنڈی ہو کر ہٹی ہو چکی تھی۔ میری "ناخیرمہ" اُن کا چیں بجبیں ہونا بجا تھا۔ مینے خوشامدانہ لہجہ میں کہا:-

"دیر ہو گئی..... آپ کو بڑی کوفت ہوئی ہوگی..... فٹ بال کھیلتے ہوئے ایک کانٹا پاؤں میں ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ کوشش کے باوجود تیز نہ چل سکا" جیسے اُنھوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ تھوڑی دیر میں لگن میں پانی، پانی میں میرا پاؤں اور اُن کے ہاتھ میں سوئی تھی۔ کانٹا نکالا جا رہا تھا۔ میرا پاؤں انکے نازک ہاتھوں پر لٹکا ہوا تھا۔

شام کا سہانا وقت، برسات کی پرشور ہوائیں۔ آسمان پر اُبلتے بادلوں کا ہجوم، شفق کی رنگینیاں، پرندوں کی چہکار، دیواروں پر سورج کی الوداعی شعاعوں کا مرتعش انعکاس، کائنات پر سرخوشی اور میرے

جو دیر مدہوشی مسلط تھی۔ کانٹا کبھی نہ نکلے خدا کرے، جلد جھٹپٹا ہو جائے اور کانٹا نظر نہ آئے۔ کوئی کانٹا نکالتا رہے نکالے جائے۔ کسی کی نازک اور نرم انگلیاں بار بار میرے تلوے سے مس ہو کر میری روح کو گدگداتی رہیں۔ بدمست اور مخمور نگاہیں لحظہ بہ لحظہ اُٹھ اُٹھ کر او میرے چہرہ پر جم جم کر میرے کرب و اضطراب کا جائزہ لیتی رہیں۔ کانٹا نکال پھینکنے کی فکر کا انہماک یہ سوچنے کی فرصت ہی نہ دے کہ رات ہو جائے۔ انہماک بڑھتا جائے اتنا بڑھے کہ سر و دوش کا ہوش نہ رہے۔ زلفیں بکھرتی اور سنورتی رہیں، چہرہ کا رنگ متغیر ہوتا رہے، تابدار پیشانی پُرنم ہو جائے اور حسن، رکھ رکھاؤ کی بندشوں سے آزاد ہو کر سکون کا سانس لے، یہ تھی میری تمنا۔۔۔۔ واحد تمنا! ــــــ اب کانٹے کی کھٹک نیم شعوری لذت، سرمدی کیف، سرور، مسکر، فتادگی، خود سپردگی، گدگدی اور تلملاہٹ سے بدل چکی تھی، عشق انگڑا رہا تھا ــــــ آہ کانٹا نکل گیا

نو دس مہینے بعد ایک ایسی ہی پر فضا شام کو اس چہار دیواری کے اندر ہیں لرزتے ہوئے ہاتھوں سے انہیں ریشمی موزے، کمربند، موباف اور نقلی موتیوں کے بُندے تحفتہً پیش کر رہا تھا۔ یہ حقیر تحفے میں ناگپور سے ان کے لئے لایا تھا یہاں دو تین سال سے بغرض کسب تعلیم مقیم تھا اور تعطیلات کے علاوہ کبھی وطن نہ آتا تھا۔

"تلوے سے کانٹا نکال کر جو نشتر روح کی رگ میں اس تاریخی شام کو پیوست کر دیا گیا تھا اس کی خلش نے کبھی اور کہیں میرا پیچھا نہ چھوڑا!

جماعت، مطالعہ کا کمرہ، تفریح گاہ، کھیل کا میدان، خوابگاہ کونسی جگہ تھی جہاں میں اور میرے سامنے ان کا تصور نہ ہوتا تھا۔ ان کی متبسّم آنکھیں۔ گھنی گھنی کالی بھنویں، لہراتی ہوئی اور بل کھاتی ہوئی زلفیں دمکتی ہوئی پیشانی، دہکتے ہوئے رخسار، مہکتا ہوا لباسِ جمیل، لرزاں اور بادہ بریز ہونٹوں کی جنبش۔ کائنات کی ہر چیز میں مرتسم ہو کر رہ گئے تھے۔ کتاب پڑھنے بیٹھتا وہ مسکرانے لگتیں، تقریر کرنے کھڑا ہوتا وہ گدگدانے لگتیں، تماشہ گاہوں میں جاتا وہ تادیبی نظروں سے گھورنے لگتیں ۔۔۔

میں اب ہر امتحان میں اول آنے لگا۔ میری ہر تقریر حاصلِ تقاریر سمجھی جانے لگی۔ اسکولوں کا ہر مشاعرہ میری غزل پر ختم ہونے لگا۔ محلہ کے بزرگوں میں میرے اطوار محمودہ کا چرچا تھا۔ کالجوں میں میری ذہانت و فطانت کے افسانے گھڑے جاتے تھے۔ غرض اس خلش نے میری کایا پلٹ دی تھی ۔۔۔۔ ہاں تو میں یہ حقیر تحفے پیش کر رہا تھا۔ یہ حقیر ۔۔۔ حسن کی ملکہ کی بارگاہ میں کمر بستہ اور مودب ۔۔۔ خدائے حسن کے حضور میں لعلی موتیوں کے منہ سے۔ کاش میں آسمان سے ثریا کا جھومر توڑ کر لا سکتا، رفعتِ افلاک سے کہکشاں کو چرا سکتا، آکاش کے ستاروں کے قمقمے آفتاب اور ماہتاب کی قندیلیں چھین کر لا سکتا ان کو تحفۃً میں پیش کرنے کے لئے ۔۔۔ مسکراتی ہوئی نگاہوں اور نگاہِ تبسم نے میرے حقیر تحفہ کا خیر مقدم کیا۔ یہ حقیر تحفہ مقبول بارگاہ

ہوگیا اور جواب میں ایک چھوٹی سی ٹین کی ڈبیہ (جسمیں دیہاتی لوگ چونا رکھتے ہیں) جس کے اوپری حصہ میں ڈھکنا تھا اور جو یکسر خالی تھی، پیش کی گئی ——— ایک خالی ڈبیہ ——— ڈبیہ کھولنے کا حکم اور ساتھ ہی ساتھ اسے بنظرِ غائر دیکھنے کی تاکید ہوئی۔ میری نظریں ڈبیہ کا جائزہ لینے لگیں۔ کانٹے کی ٹوٹی ہوئی چھوٹی سی نوک۔ "آخر یہ کیا مذاق ہے" میں نے تنگ آکر کہا۔ جواب میں بتایا گیا یہ وہی کانٹا تھا جو دس ماہ قبل ایک رنگین شام کو میرے پاؤں سے نکالا گیا تھا۔ آخر اسے اس اہتمام سے رکھنے اور اس تقریب سے پیش کرنے کی ضرورت " بہر تسکینِ دردِ محبت " ۔ آہ یہ دردِ محبت کی تسکین کے لیے ایک خنجر کا نشانہ کافی ہو اس کے حضور میں ماہ و پروین ثریا اور کہکشاں کی پیشکش کی تمنا .... !

میری شادی ہو گئی بالکل اسی طرح جیسے کوئی حادثہ پیش آجائے وہ اس شادی سے خوش نہیں۔ شاید صرف اس لیے کہ میں اپنی رفیقۂ حیات کو ناخوش نہ کرسکوں۔ شادی کے بعد ایک دن جب انکی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے میرے چہرہ سے تکان اور کسل کا اندازہ لگا کر تکیہ پیش کرتے ہوئے فوراً کچھ دیر آرام کر لینے کا حکم نافذ کر دیا۔ میں نے آنکھیں بھینچ لیں اور تھوڑی دیر بعد سو گیا۔ جون کا مہینہ، دوپہر کا وقت اور شدت کا حبس، ایک گھنٹہ بعد ہی آنکھ کھل گئی میرے پلنگ سے ہٹ کر کچھ دور وہ فرش پر محوِ خواب تھیں مستِ خواب ناز اسطرح کہ

جہانِ آرزو نکھر آاٹھا۔ جذبات میں ہیجان بپا ہوگیا ——— کیوپڈ کی آغوش وا ہوئی، وہ حسن اور حسن کی بے پایاں لطافتوں کو بیک وقت اپنے کوتاہ و تنگ دامن میں سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ حسن کا فر کسمسایا چونک پڑا تمام فتنے بیدار ہوگئے۔ اب جمال جلال کے روپ میں تھا، ہوائے ارنی لن ترانی کی زد میں تھی، حسن اور حسن برہم پناہ بخدا! عشق کی جسارت پر حسن کی ہر ادا قہقہہ زن تھی، دیواریں معنوم تھیں۔ کائنات کا ہر ذرہ منتظم ہم آہنگی سے چیخ رہا تھا۔ خوشبو کا مشام دہن کی لذت کا سامان بہم نہیں پہنچا سکتی شفق کی ضو چکا چوندوں سے جھونپڑوں کے دیئے روشن نہیں کئے جا سکتے۔ قوس قزح کی رنگینیوں سے دستاریں نہیں رنگی جا سکتیں، ستاروں کے لاہوتی نغموں کو ساز کے پردوں میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ کیوپڈ سہم گیا انہیں دیکھے ہوئے زمانہ ہوگیا، ان سے ہمکلام ہوئے مدتیں گذر گئیں مگر اب تک ؎

یہ اُنکی نگاہوں کے تبسم کا اثر ہے
ہر ذرہ میں رنگینیٔ صد شام و سحر ہے

اور وہ "ہم نے سُنا ہے زندہ ہیں مگر اس حال میں کہ ؎

دل تھام کے با دیدۂ تر کہتے ہیں ہر دم
کمبخت کی آہوں میں قیامت کا اثر ہے

اور کانٹا" ؎

کچھ کھٹکتا تو ہے پہلو میں مرے رہ رہ کر ::: اب خدا جانے تیری یاد ہے یا دل میرا

بارِ دوش

آنکھ جھپکی ہی تھی کہ دوسری دُنیا میں تھا۔ ایک پلنگ پر ہم دونوں
ایک ہی برتن میں دودھ چاول کھا رہے تھے۔ ابھی حیا گسار نگاہوں کی
پنہائیوں میں معصومیت آسودہ تھی۔ دل "دزدیدہ نگہ" ندی ہمیں از نا
نگاہ سے "کے ساتھ ساتھ کتابِ خویش می شوئم بہ مہتاب" کے صحیح مفہوم
سے بالکل پہلی مرتبہ آشنا ہو رہا تھا۔ اضطراری یا غیر اضطراری۔ شعوری
یا نیم شعوری طور پر کتنی مرتبہ انھوں نے کھانے کا چمچہ اپنے منھ سے لگانے کی بجائے میرے منھ سے
لگا دیا یہاں تک بیٹھے بیٹھے دست کش ہو گیا۔ انھوں نے جھٹ پٹ ایک گلوری بنا کر
میرے منھ میں رکھ دی۔ تمباکو کی تیزی نے دماغ کو متاثر کیا اور میں تکیہ کا
سہارا لے کر لیٹ گیا۔ وہ کھاتی رہیں۔ انکا زانو آہستہ آہستہ میرے سر کی
طرف بڑھ رہا تھا۔ بڑھتا رہا اور بالآخر میرے سر نے انکے زانو کے

ایک کیف آگیں لمس کے ساتھ ایسا محسوس کیا کہ کوئی وزنی چیز پہلے تو سر
اور پھر تمام وجود پر رکھ دی گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ مجھ پر کوئی دیو مسلط ہے
اعصاب بے بس۔ جوارح معطل اور دماغ ماؤف تھا۔ دھڑ دھڑ کے باوجود
جسم حرکت سے معذور ہو گیا۔ ایک وحشت انگیز چیخ کے ساتھ آنکھ کھل گئی

ڈراؤنے خواب میں نے پہلے بھی دیکھے تھے۔ خواب میں بارہا
چیخنا اور رونا بھی تھا۔ لیکن اس خواب کی نوعیت ہی
جدا تھی۔ ایک نظر آشنا شکل مرکز نگاہ تھی۔ وہ شکل جسے میں نے پہلے
ایک ہی بار دیکھا تھا اور وہ بھی "دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس" لگا ہوا
کے انداز میں، میں گردن جھکائے پاؤں سے زمین کرید رہا تھا اور وہ میری
جانب پشت کئے ہوئے کھانا پکانے میں مشغول تھیں۔ کبھی کبھی رفع
تکدر کے خیال سے ادھر ادھر کی باتیں کر لیتیں اور میں "ہاں" یا "نہ" سے
اپنی موجودگی کا ثبوت دیدیتا۔ البتہ چلتے وقت بالکل اتفاقیہ طور پر ہماری
نظریں متصادم ہو گئیں اور میں نے انہیں "زہر را اندر ردائے تو عریاں
دیدہ ایم" والی شان سے دیکھا اور تھوڑی دیر کے لئے سوچنے لگا کہ کہیں
"ز موج گل بہاراں بستہ زنار" اسی مابوحی منظر کی تفسیر تو نہیں ہے۔
وہ میرے ایک قریبی عزیز کی رفیقۂ حیات تھیں اور میرا ضمیر مجھے مجبور
کر رہا تھا کہ میں انہیں حسین نہ سمجھوں۔ تعقل میرے وجدان پر غالب
آسکا کہ نہیں یہ تو میں نہیں جانتا البتہ اس دن کے بعد مجھے ان کے
یہاں جانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ میں اسے حفظ ماتقدم کہتا ہوں

آپ کو اختیار ہے آپ اسے رعبِ حُسن کہیں یا "دل کے چور" سے تعبیر کریں۔ انکے بے محابا تصور نے خلوت میں، جلوت میں بارہا گدگدایا مگر میں نے اسے "دردیست دردلم کہ بہ درماں برابر است" سے زیادہ اہمیت نہیں دی اور انکی یاد کا بینہ ہمیشہ "بیفشاں دامن و آزاد برخیز" سے خیر مقدم کیا۔

انکے شوہر ضرورت سے زیادہ سادہ اوفات اور ناخوش ذوق واقع ہوئے ہیں۔ ناخواندہ ہیں اور انکی شخصیت کسی بھی حیثیت سے جاذبِ توجہ نہیں کہی جا سکتی۔ پھر بھی بیحد پر خلوص اور منتواضع ہیں۔ انہیں ہمیشہ شکایت رہی کہ میں ان کے یہاں کیوں نہیں آتا جاتا جبکہ وہ اور انکی اہلیہ میرے یہاں اکثر آتے جاتے ہیں۔ مجھے علم تھا کہ میری عدم موجودگی میں وہ میری بیوہ ہمشیرہ کے پاس اکثر آتی تھیں۔ لیکن خدا جانے کیوں مجھ میں انکے یہاں جانے کی سکت نہ تھی۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ خواب اپنی نوعیت کا پہلا خواب تھا۔ اسلئے نہیں کہ ان کا زانو سر پہ رکھتے ہی کوئی سر پہ سوار ہو گیا تھا بلکہ اس لئے بھی کہ میں اب روز یہی خواب دیکھتا اور مجھے ہر روز اسی مذبوحی کشاکش سے دوچار ہونا پڑتا۔ خواب میں دودھ چاول کھاتے کھاتے وہ اپنا زانو میرے سر پہ رکھ دیتیں اور مجھے محسوس ہوتا کہ کسی اژدہے نے جکڑ لیا۔ میں اس کوفت سے تھوڑے ہی عرصہ میں مردہ بن کر رہ گیا۔ میں نے ایک روز تنگ آکر تمام ماجرا نتھو شاہ سے بیان کر دیا۔ یہ صاحب دورِ حاضر کے زبردست عامل سمجھے جاتے ہیں اور

انکے حوارین کا بیان ہے کہ جنوں کا بادشاہ انکا تابع فرمان ہے۔ اُنہوں نے میرے غریب خانہ تک آنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ آتے ہی چمکدار سُرمگیں آنکھوں نے میری خوابگاہ کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اور قدرے تامل کے بعد اُنھوں نے نظر بچانے کی کوشش کرتے ہوئے میرے پلنگ کی بالین سے کوئی چیز نکال کر اپنی جیب میں رکھ لی اور میرے دفعۂ مرض کا مژدۂ جاں بخش فاتحانہ انداز میں سناتے ہوئے چلدیئے۔ میری تمام خوشامدیں کہ وہ مجھے تشخیصِ مرض سے مطلع فرماویں بے سُود ثابت ہوئیں اُس رات کو میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا کئی راتیں گذر گئیں اور مجھے کوئی خواب نظر نہ آیا۔ میں اب روبصحت تھا۔ شاہ صاحب نے آجتک میرے مرض کی نوعیت اور اپنے طریقِ علاج سے مجھے مطلع نہیں فرمایا۔ کوئی کہتا ہے میں "کابوس" کا شکار رہا تھا۔ کوئی کہتا ہے مجھ پر کسی تعویذ کا اثر تھا۔ کچھ بھی ہو مجھے شاہ صاحب کے کمالِ فن کا اعتراف ہے۔

تمام رمضان اس درد میں مبتلا رہنے کے بعد عید اور اسکی لذتیں میرے لئے کیا ہوں گی۔ اسکا جان لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ عید کی نماز سے فارغ ہوکر مکان آیا۔ دستور کے مطابق اعزا اور احباب کے یہاں جانے کے قصد سے انکے مکان کی طرف چلا بالکل اس طرح کہ "لے جا رہا ہے شوق چلا جا رہا ہوں میں" اور بس۔ تنہا جانا ٹھیک نہیں۔ انکے شوہر ابھی عیدگاہ سے واپس نہ ہوئے ہونگے۔ لیکن اپنے عزیز ہی تو ہیں۔ ضرور جانا چاہیئے۔ اسی قسم کے خیالات کے ہجوم میں ان کی چوکھٹ

تک پہونچ گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا انہیں میرے پہونچنے کی اطلاع کیونکر ہوئی آواز دینے سے پہلے ہی دروازہ کھلا اور اندر داخل ہونے کا حکم صادر ہوا۔ ایک پلنگ پر ایک برتن میں دودھ چاول اور دو چمچے رکھے ہوئے تھے۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گئیں اور میں بھی۔ دونوں نے ساتھ کھانا شروع کیا ع

الہٰی ایں چہ کا فرماجرا لست

ہوبہو وہی منظر جو خواب میں دیکھا تھا۔ وہ مسکرائیں، ہوائیں چلنے لگیں وہ گنگنا ئیں فضا سنگ گئی۔ میں نے انہیں گھورا، وہ مجھے تکنے لگیں۔ درودیوار جھومنے اور عشق و حُسن مچلنے لگے۔ ذرّوں سے نغمے پھوٹ پڑے خواب اور خواب کی تعبیر میں صرف اتنا فرق تھا کہ اس دن جو زانو دیو کے بوجھ کا تراوف تھا آج وہ پھول سے کہیں زیادہ سُبک تھا۔ میں فرطِ کیف سے چیخ اُٹھا۔

چہ آتشے است کہ بر جانِ ما نہادی باز

اور انھوں نے ایک مذبوحی انداز میں فرمایا :-

گوش نزدیک لبم آر کے آوازی ہست

وہ تھی عید ۱۹۳۸ء کی جب بقول کسے

کائنات کی ہر چیز پر عید کا اطلاق ہوتا تھا۔

اور یہ ہے عید ۱۹۴۴ء کی جس کی پذیرائی میں ؎

ارمان رہ گیا کسی کافر کی دید کا

خالی گا چاند اب کے ہوا چاند عید کا

یا زیادہ سے زیادہ "وائے بر عیدے کہ گذشت ابر چنیں" کہکر خاموش ہو جانے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

—————— •✱(•✱•)✱• ——————

مقدّس گناہ

محبت شاہ کو پہلی مرتبہ میں نے دربار خواجہ اجمیرؒ میں دیکھا۔ یہ پیکرِ دلنشیں "شرقی دروازہ کے قریب والے مقبرہ پر متعدد و متنوع پیشوایانِ دین" کے جھرمٹ میں آسودہ تمکین تھا متبسم نگہ حیا پاش نگاہوں سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ایک لطیف اشارہ کی تعمیل میں ہم دونوں مقبرہ پر فروکش ہو گئے۔ رسمی تعارف کے فوراً بعد ہی غزل کی فرمائش اور فرمائش کے بعد ہی غزل سرائی و غزل ستائی شروع ہو گئی۔ واہ اور اُن بادہ ریز ہونٹوں سے حُسن سے مس ہو کر دشنام بھی رنگین بن جاتا ہے۔ اُن سرمدی سُروں میں جنہیں سُن کر ناہید بھی پکار اُٹھے "شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو"
محبت شاہ شباب و شعریت کی اس منزل میں تھی جہاں "کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجا است" سکر و موسیقیت کے اس مقام سے گذر رہی

تھی۔ جہاں "حسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے" زندگی کے اس موسم میں سانس لے رہی تھی جسے دنیا "شگفتن گلہائے ناز" سے تعبیر کیا کرتی ہے اور جب ہرگام پر "فتنے اُٹھ اُٹھ کر پکارا کرتے ہیں" بیدِ مجنوں کی طرح ہر سرد تھرانے لگا" یہ تھا محبت شاہ کی مہلک جوانی کا عالم

مجھے کیا خبر تھی کہ خواجہ کے دربار میں صفتِ نظر جلوؤں کی فراوانی کا یہ عالم ہوتا ہے اور ان دنوں یہ کوچہ "صد طور تماشہ" بن جایا کرتا ہے۔

میں درگاہ بہت کم جایا کرتا ہوں۔ اور اپنے سیاہ خانے کے ایک زاویہ میں پڑا ہوا اکثر سوچا کرتا ہوں کہ عرس میں آخر تمام دنیا اجمیر میں کیوں سمٹ آتی ہے۔ کیا اس لئے کہ "جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا میں خواجہ سے" یا اس لئے کہ "میرا اخلاص سے دو پھول چڑھاتے جاؤ" ممکن ہے حضرتِ خواجہؒ وہ سب کچھ دے سکتے ہوں۔ جو (نعوذ باللہ) اللہ نہیں دے سکتا۔ یا مزارِ خواجہؒ دو پھول اور فاتحہ کے دو بولوں کو ترستا ہو، آخر یہ لوگ ان کس مپرسی مزارات پر بغرضِ فاتحہ خوانی کیوں نہیں جاتے جو حقیقتاً میرا اخلاص اور دو پھول کے محتاج ہیں اور جہاں "جز کثرتِ پروانہ" کوئی زیارت کرنے والا نہیں۔

تو پھر کیا یہ لوگ یہاں اس لئے آتے ہیں کہ فضائے دربار خواجہ سے مستفیض ہوں، سبحان اللہ جہاں دن رات قوال "خواجہ پیا رنگدے چندریا" الاپتے ہوں۔ جہاں زائرین ہر آن "کیا نور برستا ہے خواجہ تیرے گنبد سے" کا وظیفہ ورد کرتے ہوں۔ جہاں رقیق القلب صوفیا ڈھولک کی ہر تھاپ پر "سپردم بتو مایۂ خویش را" کہہ کر رقص کرنے لگتے ہوں، جہاں ہر وقت فاقہ مست درویش ہر کسی کو دیکھ کر "وہ آرہی ہے کپڑے چڑھاتے ہوئے پائینچے اٹھائے ہوئے" کا نعرہ لگاتے ہوں۔ جہاں علمائے کرام "سنگِ درِ جانانہ" سمجھ کر سر رکھ دیا کرتے ہوں۔ جہاں غنڈے کسی کو مہمان دیکھ کر دفعتاً چیخ اٹھتے ہوں "کس چیز کی کمی ہے خواجہ تیری گلی میں" اور جہاں "ندیدۂ تنم سایۂ آفتاب" کی مدعی خواتین کا یہ عالم ہوتا ہے کہ "سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں" اس جگہ کی فضا کا کیا کہنا،۔

لیکن اب میں بلاناغہ درگاہ جاتا ہوں، اور اسی مشرقی دروازہ کے پاس والے مقبرے پر گھنٹوں سر بزانو بیٹھا رہتا ہوں۔ کاش محبت شاہ جن کے انجلائے قلب و استعلائے روح کے بارہ میں ان کے ارادتمند بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ اپنے دیدۂ باطن کی روشنی میں اتنا ہی دیکھ سکتیں

کہ یہ نو گرفتارِ قفسِ جذب کی کس منزل سے گذر رہا ہے اور یہ
بتا سکتیں کہ "کہ دل کا کیا حال کروں خونِ جگر ہونے تک" مگر
انھیں تو بقول کسے، اپنے حلوے مانڈے سے کام، یعنی پیر صاحب
کے مزار کی تعمیر کے لئے چندہ۔ بمبئی کے سیٹھ اور بس۔ آہ پیر
اور ایسے کافر کا جو "خدا کو بھی نہ سونپا جائے"
فلسفۂ حسن و محبت۔ میں آج تک اس چیز کا قائل نہ تھا
اور نہ شاید ہوتا۔ اگر محبت شاہ کی "نادرشاہی" سے سابقہ
نہ پڑتا۔ میں کہا کرتا تھا کہ حسن نام ہے فریبِ نظر کا' اور
حسین کہتے ہیں گوشت و پوست کے اس مجسمہ کو جن پر جوانوں
کی حریص نگاہیں جم کر رہ جائیں .... محبت کو میں نے
پہلے کبھی "بازیٔ طفلانۂ دل" سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی
محبت میرے نزدیک حقیر قسم کے "خمارِ گندم" کا نام تھا۔ لیکن
..... آہ آج میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ محبت شاہ کا حسن
وہ حسن نہیں جسے میں فریبِ نظر کہہ کر دل کو دھوکہ دے سکوں
اور یہ میری خلش وہ خلش نہیں ہے جسے "چڑھی ہے
آندھی اُتر جائے گی" کہہ کر نظر انداز کیا جا سکے۔
خواجہ کا عرس ختم ہو گیا ہے۔ زائرین ایک ایک
کر کے رخصت ہو چکے ہیں۔ محبت شاہ بھی جا چکی ہیں۔ مگر
ان کا خیال، وہ خیال جو مومن کے "جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا"

واسے کلیہ سے یکسر مستثنیٰ ہے۔ نہیں گیا۔ وہ وجود میں رگ رگ میں تیر رہا ہے میرے "ملہمات شعری" کی تمام تجلیاں کسی کے نازک قدموں پر سر ٹپک رہی ہیں۔" الٰہی ایں چہ ماجرائی است" وہ غنی میں فقیر۔ میں حریص وہ بے نیاز محرومیٔ وصال کو سعادتِ عظمیٰ سمجھنا مجھ جیسے مغلوب الجذبات انسان کے بس کی بات نہیں۔ فراق کی کڑیاں جھیلنا ناکامیٔ محبت کو طاعتِ محبت اور ماحصل عشق گردا ننا شیوۂ اہل اللہ اور دلیلِ پختہ کاری ہی سہی۔ ۔ ۔" اس شیوۂ فرسودہ کا تتبع مجھ جیسے خاکسار سے ممکن نہیں۔ یہ سنتِ عشق میں نہ ادا کرسکوں گا ۔ ۔ ۔ پھر۔ ۔ ۔ اس سینہ کاوی سے نجات پانے کا ایک اور صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ شادی۔۔۔۔ ترک تجرد۔۔ ۔ ۔ ۔ ازدواجی زندگی۔۔۔۔۔ شادی کس سے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس یتیم لڑکی سے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں اسی یتیم زینب سے جو جہیز میں کچھ لانا تو درکنار اپنے ساتھ اپنے دو یتیم بھائی لائے گی۔ ۔ ۔ اماں کہہ رہی تھیں۔ زینب خوش رو ہے، ہوگی۔ تعلیم یافتہ ہے خیر۔ یونہی سہی۔ ۔ ۔ میں کسی غریب لڑکی سے شادی نہ کروں گا۔ نہیں میں ایسا کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے مجبور نہیں کیا جاسکتا میری موجودہ آمدنی میرے ہی احتیاج کی متکفل نہیں۔ میں کہاں سے تین تین یتیموں کی کفالت کروں گا۔ ۔ ۔ ۔ نہیں میں اپنے

گھر کو یتیم خانہ بنانا نہیں چاہتا۔۔۔۔۔۔ میرا مجموعہ کلام ۔ میرا سرمایۂ حیات زیورِ طباعت سے کیوں آراستہ ہوگا۔ ایک ہزار جلدیں۔ دو ہزار کی خطیر رقم۔۔۔۔۔ آخر کہاں سے لاؤں گا۔۔۔۔۔ میں تو کسی امیر زادی کو شریک حیات بناؤں گا۔۔۔۔۔ آہ ۔۔۔۔۔ محبت شاہ، کافر محبت شاہ ہاں محبت شاہ کے معاملہ میں، میں اپنا نظریہ بدل سکتا ہوں، بدل دوں گا۔ اس در یتیم کی خاطر افلاس کی لعنت کو گوارا کرلوں گا۔۔۔۔ مگر وہ تو "جو تو ہے وہی میں ہوں اے جلوۂ جانانہ" بن چکی ہے۔ جس نے اللہ سے لولگائی ہو اُسے مجھ جیسے گنہگار سے کیا سروکار ۔

اسے میں پا نہیں سکتا یہ جانتا ہوں مگر
ہر ایک سانس میں بڑھتی ہے آرزو اسکی

ایک روز میں ان ہی خیالات میں غرق دفتر پہونچا میز پر ایک خوش رنگ لفافہ پڑا ہوا تھا۔ پتہ نسوانی نقوش کا مرہون نظر آیا بسرعت تمام چاک کرکے پڑھنا شروع کیا۔

میرے شفیق

زینب اب بھی یتیم ہے مگر غریب نہیں۔ اب وہ اتنی رقم کی مالک ہے جس سے صرف اس کے یتیم بھائیوں کی تعلیم و تربیت ہی بدرجہ احسن نہیں ہو سکتی بلکہ کسی کا مجموعۂ کلام و مضامین بھی

زیور طباعت سے آراستہ ہو سکتا ہے۔ کہئے اب کیا کسر باقی ہے۔ جلب زر کے سلسلہ میں زینب نے دنیا کو دھوکہ دیا۔ دھوکا کون نہیں دیتا کیا آپ کے ضمیر نے آپ کو کبھی دھوکہ نہیں دیا۔ کیا آپ کی نگاہیں آپ کو دھوکہ نہیں دیتیں۔ بیشک زینب نے گناہ کیا۔ لیکن کیا گناہ مقدس قسم کا فرمایئے یہ ترکیب کیسی رہی آج تک بیوقوف زندہ ہیں مفلس مفلس نہیں رہ سکتا۔

طالب عفو زینب عرف محبت شاہ

میں دفتر جانے کی تیاری میں مصروف ہوں۔ زینب سامنے بیٹھی ہوئی میرے لئے پان بنا رہی ہیں۔ ایک حسین بچہ ان کی گود میں کھیل رہا ہے وہ اسے پیار کر رہی ہیں اور مجھ سے پوچھتی ہیں :-

"حسن کہتے ہیں کسے اور محبت کیا ہے"

پھانس
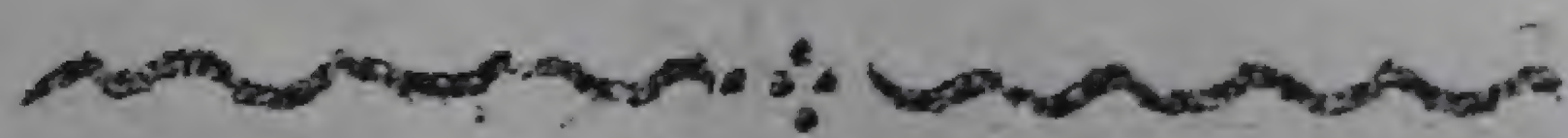
سخنے چند زعم ہائے ہنائی لبشنو

ایک مقابلہ کے امتحان میں شرکت کی غرض سے بلسار
جارہا تھا۔ فرنٹیر میل میں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ بڑی دقت
سے کھڑکی کے ذریعہ ایک چھوٹے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوگیا
قلی نے کھڑکی سے سامان ٹھونس دیا۔ حواس بجا ہونے
اور سامان جمانے کے بعد کمپارٹمنٹ کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا
کہ مجھے ایک بڑی بی اور ایک سہ

بہ سامان دو عالم گلستان رنگ
زتاب رخ چراغان لب گنگ

قسم کی محترمہ کی ہمسفری کا فخر حاصل ہے۔ میں فرط مسرت

سے گنگنا اُٹھا ۔

بڑی بی نماز میں مصروف ہوگئیں، میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ع

سجادہ گستری تو دمن بستر افگنم

پر عمل کیا اور برابر والی سیٹ پر متصرف ہوگیا۔ کسی نے مزاحمت نہ کی۔ محترمہ سالنامۂ حجاب کے مطالعہ میں ہمہ تن غرق تھیں لیکن ع

بہ شوخی کہ رخِ افتراں بہ گردانیم

بڑی بی نماز سے فارغ ہوئی ہی تھیں کہ محترمہ نے سالنامہ سے ایک غزل کے منتخب اشعار ترنم میں سنانے شروع کردیے۔ "دیکھئے کتنے پر مغز اشعار ہیں، بڑا بے پناہ کہنے والا ہے۔ شعرائے جدید میں کوئی بھی اس کے مقابلہ پر نہیں لایا جاسکتا۔ آپ اس کی ہر غزل میں سوز آگینی اور تسلسل پائیں گے،، سنئے۔

اے رہ نوردِ عشق ذرا دیکھ بھال کے ؛ ظالم یہیں کہیں ہے قیامت چھپی ہوئی

دیکھے ہوئے کسی کو زمانہ ہوا مگر ؛ اب تک ہے ایک پھانس سی دل میں چھپی ہوئی

تغزل اور ترنم میں ڈھل جانے کے بعد، ترنم وہ بھی کسی جانِ تغزل کے منہ سے۔

میں "ہزار گونہ سخن در دہان و لب خاموش" بیٹھا رہا۔ انھیں کیا معلوم کہ جس خوش قسمت شاعر کی تعریف میں وہ زمین و آسمان

کے قلابے ملا رہی ہیں۔ وہ ان کی برابر والی سیٹ پر بیٹھا ہوا انہیں نیاز کیش مندانہ نگاہوں سے تک رہا ہے۔ میں خود نمائی کے جذبے سے مغلوب ہو گیا۔ سگرٹ کیس نکالنے کے بہانے سے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور اس کا وہ رُخ جس پر خوبصورت حرفوں میں میرا تخلص ندیم لکھا ہوا تھا، اُن کی جانب کر دیا۔ انھوں نے ہینڈ بیگ کو اور پھر مجھے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بڑی بی کے کان میں کچھ کہا۔ بڑی بی بے ساختہ بول اٹھیں "آپ کا اسم شریف"

"میں، میں، خاکسار کو ندیم کہتے ہیں"۔

"ہم لوگ بڑے خوش نصیب ہیں کہ ندیم جیسا ادیب و شاعر ہمارا رفیقِ سفر ہے۔

میں خاموش رہا۔ اب تو شعر و شاعری پر معرکہ آرا بحث چھڑ گئی۔ شاید ہی کوئی بدقسمت شاعر بچا ہوگا۔ جس پر صحیح یا غلط، تنقید و تبصرہ نہ ہوا ہو۔ میں نے بھی جی کھول کر داد ہمہ دانی و ہمہ فہمی دی، کافی رات جا چکی تھی۔ حواس پر نیم شعوری کیفیت طاری تھی۔ تھوڑی دیر میں کمپارٹمنٹ میں سکوت تھا اور ہم لوگ اپنے اپنے بستر پر، مجھے نیند نہ آرہی تھی۔ جلد جلد کروٹیں بدل رہا تھا اور کبھی کبھی غالب کی ع

"زہرا را اندر دائے نو ز عریاں دیدہ ایم"

والی غزل گنگنا اٹھتا۔ گاڑی بڑی تیزی سے چل رہی تھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے مجھے لوریاں دے کر سلا دیا۔
کچی نیند میں میں نے شانے پر ایک نازک اور گرم گرم ہتھیلی کی لمس محسوس کی۔ چونک پڑنے پر مجھے مترنم آواز میں بتایا گیا کہ بلسار کا اسٹیشن آگیا۔ میں ہڑبڑا کر اتر پڑا اور اپنے حسین رفیق سفر کی مدد سے سامان اتار لینے میں کامیاب ہوگیا۔ گاڑی چلدی۔ میں انھیں اور وہ مجھے گھورتے رہ گئے...
میں گنگناتا ہوا قلی کو ڈھونڈنے لگا۔

"مژدہ صبح دریں شیرہ شبانم دادند"

امتحان میں کامیاب ہوگیا۔ ٹھیک ایک سال بعد گجرات کے ایک روڈ سائڈ اسٹیشن پر ٹکٹ کلکٹر کی حیثیت سے میرا تقرر ہوگیا۔ یہ جگہ آب و ہوا کے اعتبار سے تو اچھی تھی مگر "زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم" دمیوں چھپے، اور کیم چھے، سے بڑی وحشت ہوتی۔ ماحول کی ابتری اور بھی سوہان روح تھی۔ یہ معلوم کر کے کہ کوئی مسلمان ڈپٹی اسٹیشن ماسٹر ہو کر آرہے ہیں۔ بڑی طمانیت ہوئی۔ ایک روز شام کو وہ مع اہل و عیال اتر پڑے۔ کوئی کوارٹر خالی نہ تھا۔ اسٹیشن ماسٹر کی خواہش کے مطابق میں نے اپنے کوارٹر کا نصف حصہ ان کے تحت و تصرف میں دیدیا۔ ڈپٹی صاحب بڑے سنجیدہ بزرگ تھے اور ان کے گھر

کا بچہ بچہ خوش اخلاق تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت اور بے انتہا مسرت ہوئی کہ فرنٹیر میل والی محترمہ بھی مکینوں میں سے ایک تھیں۔ وہ ڈپٹی صاحب کی بھانجی تھیں اور ان کے والدین کا سایۂ عاطفت صغرسنی ہی میں ان کے سر سے اٹھ چکا تھا۔ اب ڈپٹی صاحب کی کفالت ہی میں ان کی تربیت و تعلیم ہو رہی تھی۔ وہ ادیب کا امتحان پاس کر چکی تھیں اور اس سال ادیب عالم کے امتحان کی تیاری کر رہی تھیں۔ ڈپٹی صاحب کے ایما اور خود ان کے اصرار سے میں نے انھیں پڑھانا شروع کر دیا۔

وہ بلا کی ذہین تھی اور خیال تھا کہ دو ماہ میں کورس ختم ہو جائے گا۔ مگر اس پر کیف صحبت کو ایک ماہ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ برہم ہو گئی۔ میں تخفیف میں آگیا اور ڈپٹی صاحب کی ان تھک کوشش کے باوجود بھی مجھے وطن آنا پڑا ؎

گرفتہ ام زکوئے تو آساں نہ رفتہ ام

دس گیارہ ماہ بعد ریلوے کا حکم ملا کہ میں کسی دوسرے ڈسٹرکٹ میں جانا چاہوں تو ملازمت مل سکتی ہے میں نے جواب میں رضا مندی کا اظہار کر دیا اور میرا تقرر احمد آباد اسٹیشن پر ہو گیا۔ ایک روز مجھے آنند جنکشن تین دن کے لئے ریلیونگ ڈیوٹی پر جانے کا حکم ملا۔ وہاں خلاف توقع زیادہ رکنا پڑا اور چونکہ مختصر قیام کے لحاظ سے میں قلیل رقم لے کر گیا تھا۔ مجھے قلت زر کے باعث

مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ نیا اسٹیشن ہونے کے باعث کسی سے قرض طلب کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ہیڈ ٹکٹ کلکٹر کام کی زیادتی کے باعث اسٹیشن چھوڑنے کی اجازت دینے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ ایک دن نو دو بجے تک کھانا میسر نہ آیا۔ اور برج گیٹ پر میری ڈیوٹی تھی۔ میں شکم پری کے مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ کبھی سوچتا تھا ہوٹل والے سے ادھار کھانا لے لوں، کبھی کہتا نہیں اس میں سبکی ہوگی۔ کبھی کہتا ہیڈ ٹکٹ کلکٹر سے صورت حالات بیان کر دوں اور کچھ رقم قرض لے لوں۔ لیکن غیرت کسی فیصلہ پر پہنچنے نہ دیتی تھی۔ اسی بے خیالی اور پر خیالی کے عالم میں پاؤں کی چاپ سنائی پڑی۔ میں نے حسب عادت چونک کر جیسے کوئی گہری نیند سے چونک پڑے کہا "ٹکٹ پلیز" آنے والوں میں سے ایک سے آنکھیں چار ہوئیں اور میں دم بخود رہ گیا۔ فرنٹیر میل والی محترمہ اور ان کے ساتھ ایک بیحد معمولی شکل و صورت اور وضع قطع کے معمر بزرگ محترمہ نے مزاج پرسی کی۔ شکوہ و شکایت کے ساتھ ایک سانس میں سب کچھ بتا دیا وہ بیوی اور ایک بچے کی ماں بن چکی تھیں ان کی زندگی بے کیف تھی۔ وہ مجھے اب بھی یاد کرتی تھیں۔

انھوں نے اپنے مکان کی نشاندھی بھی کی اور شام کو ملنے کا وعدہ لے کر اسٹیشن اور پھر مکان واپس چلی گئیں۔ اس تمام عرصہ میں ان کے "سرتاج" (بیچارے بڑے شریف تھے) دور کھڑے

رہے۔

اب میں ایک دوسری فکر میں مبتلا ہو گیا۔ اُن کے بچہ بھی ہے اس کے لئے کھلونے لے جانے چاہئیں کسی کے گھر خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ کم سے کم پانچ روپے تو ہوں۔ ہمت کر کے ہیڈ ٹکٹ کلکٹر سے قرض مانگ لوں گا۔ میں انہی خیالات میں منہمک تھا۔ کہ ہیڈ ٹکٹ کلکٹر صاحب آ گئے۔ اور قبل اس کے کہ میں کچھ کہتا انھوں نے پہلی ٹرین سے سابرمتی جنکشن ریلیونگ ڈیوٹی پر جانے کا حکم سنا دیا۔ میں پہلی ٹرین سے روانہ ہو گیا مگر سابرمتی کے لئے نہیں بلکہ وطن کے لئے مستعفی ہو کر وہ پہلے متواتر یاد آتی رہیں اور اب کبھی کبھی ۔

حسین مغالطہ

وکیل صاحب پر فرطِ مسرت سے نیم شعوری کیفیت طاری
تھی۔ ان کا جذبۂ محبت مکمل طور پر مشتعل ہو چکا تھا۔ "جمالِ ہمنشیں
درمن اثر کرد" کے بمصداق وہ مجسم معصومیت بنے ہوئے تھے ان
کے پرجلال بشرے سے تدبر و تفکر کی علامتیں مفقود ہو رہی تھیں
اور ان کی جگہ خلوص و کرم نے لے لی تھی۔ ان پر ایک طویل و مسلسل
بیخودی طاری تھی۔ ننھے ارشد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ
اس درجہ کھو گئے تھے کہ تمام کائنات ان کا ایک رنگین خواب
بن کر رہ گئی تھی۔ وہ "بے خبر از ہمہ عالم چہ بلند است و چہ
پست" ہو کر ارشد کو چوم رہے تھے۔ چومتے چلے جا رہے تھے
ارشد بھی غافل نہ تھا۔ وہ وکیل صاحب کے التفاتِ پیہم کا جواب

آغوں آغوں کے لطیف و شیریں نغموں سے دے رہا تھا۔ وکیل صاحب کے بالوں کو نوچ نوچ کر ان کے ہر تلطف کا گرم جوش خیر مقدم کر رہا تھا۔ دو معصوم روحیں دست و گریباں تھیں دو معصوم فرشتے ملکوتی زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ فضا آغوں، آغوں ٹوہوں، ٹوہوں کے مترنم نغموں سے گونج رہی تھی۔

وکیل صاحب دفعتاً چلائے " الّو کہیں کا" نالائق۔ ہم پہلے ہی جان رہے تھے کہ آپ ضرور شفقت فرمائیں گے۔ ارے کوئی ہے۔ ذرا لینا۔ تمام کپڑے خراب کر دئے بدمعاش نے، لچا کہیں کا۔ آپ مسکرا کس لطف سے رہے ہیں۔ نکٹے کہیں کے بے نیازی کے ساتھ، ایک فاتحانہ انداز سے، گویا کچھ ہوا ہی نہیں اور ہوا بھی کیا تھا۔

وکیل صاحب نے زنانہ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ " انور تہبند لانا۔ کپڑے بھی نکال دو۔ پاجامہ قمیص دونوں خراب ہو گئے ہیں۔ بنیان بھی تو ہو گیا ہے۔

" اچھا ہوا" انور نے منہ بگاڑتے ہوئے کہا" ہم نے کم سے کم ایک لاکھ مرتبہ کہدیا کہ اتنا ڈ ہیں کیا کرتے، ادھر سے آئے ارشد، اُدھر سے آئے ارشد' ارشد' ارشد دن بھر دفتر میں رہنا اور فرصت میں ارشد سے کھیلنا

اس گھر میں اور کوئی تو گویا رہتا ہی نہیں۔ ارشد کو کھلانے
کے لئے ایک چھوڑ دو دو نوکر نہیں صاحب ان کے چہیتے
ارشد اگر روز ان کی گت نہ بنائیں تو لطف ہی کیا۔ یا تو یہ
نفاست کپڑوں پر مکھی بھی نہ بیٹھنے پائے۔ بستر پر شکن نہ آنے
پتلون کی کریز نہ بگڑے، یا یہ کہ ارشد میاں کی تمام تر حماقت
تابیوں کو گوشۂ قمیص میں پناہ دی جائے توبہ، ایسا بھی کیا
چوچلا کوئی دو باتیں کرنے کو ترستا رہے۔ گھر میں گھسنے کا نام
ہی نہیں اور گھسے بھی تو اپنے لاڈلے کا گو اور موت دھلوانے
کے لئے۔ ہم کہے دیتے ہیں کہ آئندہ ہم ان باتوں کے روادار
نہ ہوں گے۔ کوئی شوق سے دن دن بھر گھومے۔ ارشد سے
کھیلے اور یہ کھلونے لا لا کر دے۔ ہم سے دن دن بھر چیتھڑے
نہیں دھوئے جاتے۔ نہ صاحب ہمارا تو ناک میں دم ہو گیا
جب دیکھو ارشد۔ یہ کیا لائے۔ ارشد کا ہیٹ، یہ کیا ہے
ارشد کے موزے، اور یہ کیا ہیں ارشد کے کھلونے اگر کہیں
اپنا ہی جایا ہوتا تو خدا جانے کیا کرتے۔ آسمان سے تارے
توڑ لاتے۔ حرامی بچے کے پیچھے اپنی جان ہلکان کر رکھی ہے
اور دوسروں کو بھی چین نہیں لینے دیتے۔ مزے لوٹیں نمازی
میاں دھکے کھا دیں مجاور۔ پیدا کرنے والوں نے پیدا کر دیا
اب جانے ان کی بلا۔ بندر کی بلا طویلہ کے سر۔ بویا نہ جوتا

اللہ میاں نے دیا پوتا۔ مفت کا عذاب ہمارے سر۔ ہم سے یہ ناز برداری نہیں ہو سکتی۔ کپڑے لیجئے نوکر کو آواز دیتے ہوئے "ادھر لاؤ اس کمینے کو" بچہ کو نہلا دھلا کر اور کپڑے بدلوا کر واپس لاکر ملازم کے حوالے کرتے ہوئے لیجاؤ گھما لاؤ۔ دیکھو آئندہ تمہارے سوا اسے کوئی ہاتھ نہ لگا دے۔ کسی کو میری اجازت بغیر مت دو۔ وکیل صاحب نے ارشد کو نوکر سے چھین لیا اور اس کے نازک گالوں پر گرم گرم بوسوں کی بھر مار کر دی۔ انور نے ڈپٹ کر کہا "جی کہہ دیا تھا ہم نے کہ آئندہ نہ کھلایا کریں گے آپ کوئی بھگتتا رہے آپ کی بلا سے مگر ارشد اتنا ہی عزیز تھا تو شادی نہ کی ہوتی کسی غریب کی بیٹی کا کرم کیوں پھوڑا۔ دوسرے کی پاپ کی گٹھری کو لا دے لادے پھرنا کہاں کی معقولیت ہے۔ نہ بابا ہم سے تو یہ پاپڑ نہ بیلے جائیں گے۔

"انور، انور کیا کہہ رہی ہو تم کتنا بھولا بچہ ہے یہ معصوم وجود، کتنا جانفزا ہے اس کا تبسم، کتنا بے ساختہ پن ہے اس کی ہر ادا میں کتنی روشن پیشانی جیسے بیاض نور پتلے پتلے نازک ہونٹ یا متحرک برگ گل۔ انور دیکھو کیا تمہیں یہ سب کچھ نظر نہیں آتا۔ انور کیا سچ مچ تمہیں ارشد پہ پیار نہیں آتا۔ اتنی سنگدلی اتنی سرد مہری ہوا نور۔ دیکھو انور اس کے

لطیف تبسم کو، ذرا غور سے دیکھو قریب سے دیکھو، یہ جاندار کھلونا انور تمہاری آنکھوں سے کتنی مشابہت ہے۔ ارشد کی آنکھوں کو، ہو بہو تمہاری تصویر ہے، دیکھو بالکل تمہاری آنکھیں، سرمئی آنکھیں نیم خواب مدبھری سرشار آنکھیں، بعینہٖ تمہاری تصویر۔ ہاں فرق ہے مگر خفیف سا، تمہارا حسن صبر آزما ہے۔ تمہاری آنکھوں میں کشش ہے۔ مگر تابش بھی بلا کی ہے، انور یہ کبھی کبھی شعلہ ریز بھی ہو جاتی ہیں۔ مگر انور کی آنکھیں شعلہ ریزیوں سے نا آشنا ہیں۔

انور تم بار بار ارشد کو حرامی کہکر اپنی اخلاقی کمزوری کا مظاہرہ کیوں کیا کرتی ہو۔ آخر یہ متنفر کیوں، یہ حقارت کس لئے صرف اس لئے نہ کہ اسے ایک بنت آدم نے، تمہاری ایک بہن نے اس عالم میں جنا جبکہ وہ ازدواجی قیود سے آزاد تھی۔ جب اس پر کسی مرد کے انقیاد و اطاعت کا بوجھ نہ لادا گیا تھا ولدالزنا یا نطفۂ ناتحقیق ہونے کی ذمہ داری اس غریب پر کیوں عائد کی جا سکتی ہے تمہارے اور تمہاری سماج کے قصور وار تو وہ ہیں۔ جنہوں نے جائز یا ناجائز طور پر اس کی تخلیق و تولید کی۔ ایک اچھی چیز سے صرف اس لئے نفور کرنا کہ اس کی خلقت بُری چیزوں کے اتصال کا نتیجہ ہے۔ اچھی بات نہیں انور سوچو۔ اس معصوم نے ہمارا کیا بگاڑا ہے شاید تمہیں

معلوم نہیں کہ اس کی ماں پر سماج والوں نے کیا کیا مظالم ڈھائے ہیں۔ اس کی حالت قابل رحم ہے اور۔ وہ عزیزوں سے چھوٹی احباب سے چھوٹی، وہ سب سے کنارہ کش ہو کر کس مپرسی کی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور رہوئی۔ اب اس کی زندگی کو زندگی کہنا بھی بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ وہ طعن و تشنیع کا ہدف بنی، اس پر وہ مظالم توڑے گئے جس کے برداشت کرنے کی اس میں قوت نہ تھی اور ارشد، یہ شفقت کا محتاج ہے۔ یہ اپنے والدین کی شفقت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس کی ماں صرف اسے پیدا کرنے کی گناہگار ہے۔ شاید اس نے جی بھر کر اسے دیکھا بھی نہ ہو، شرم آتی ہوگی آپ کو ایک آبرو باختہ ننگ خاندان چڑیل کی، ایک ایسی رسوا عالم عورت کی جس نے حظِ نفسانی کی بھینٹ پاکدامنی اور عفت جیسی گرانمایہ شئے چڑھا دی۔ تعجب ہے آپ جیسا مدعی علم و دانش عصمت مآبی کی بیش قیمت سے ناواقف ہو اور آنکھ بند کر کے ایک ذلیل عورت کی حمایت کرے۔ جو عورت اپنے جوہر عصمت کو سرِ راہ برباد کر سکتی ہے۔ جو عورت اپنی نسائیت اور اس کی عظمت کو برسرِ عام کچل سکتی ہے۔ جو عورت اپنے خاندانی اور مذہبی روایات کو دن دہاڑے غارت کر سکتی ہے اس کو عورت کہنا، عورت ذات کی توہین کرنا ہے۔ حمایت اور ایک زانیہ کی شریعتِ حسنہ کو پسِ پشت ڈال کر یہ اخلاقی رواداری نہیں، غداری

ہے۔ مذہب سے، شریعت سے۔۔۔۔ اس کی ماں نے مظالم برداشت کئے اور برداشت کرے گی۔ اس لئے کہ اس نے ظلم کیا تھا شریعت پر، اس نے ستم توڑے تھے، اخلاق و مذہب کی روح پر، مجھے معذور رکھئے ان موضوعات پر مجھ سے گفتگو کرکے میرا جی نہ جلایا کیجئے۔ شریعت ان معاملات میں آپ کی مزعومہ رواداری اور بر خود غلط شریعۃ النفسی کو وجہ جواز قرار نہیں دے سکتی۔

"انور ٹھہرو" وکیل صاحب نے کہا "مجھے تسلیم ہے وہ قصور دار ہے۔ اس قصور کی سزا اسے بھگتنا چاہئے اور بھگت بھی رہی ہے۔ اس کے والدین نے اپنے دامن عاطفت سے الگ کر دیا کیا یہ کم سزا ہے۔ وہ اپنے عزیزوں، ہم جلیسوں، ہمدردوں اور ہمجولیوں سے دور تنہا زندگی بسر کر رہی ہے۔ کیا اس سے زیادہ اور کوئی سزا ہو سکتی ہے وہ اپنے لخت جگر کو دوسروں کی آغوش میں دیکھ رہی ہے۔ چپ چاپ دیکھ رہی ہے اور وہ اسے اپنے سینے سے نہیں لگا سکتی، اس کو گلے نہیں لگا سکتی۔ اس کو جی بھر کر بھی دیکھ نہیں سکتی۔ یہ کم سزا ہے انور ایک ماں کے لئے اسے ماں کی دہکتی ہوئی آگ میں جھونکا جا رہا ہے۔ اس کا ضمیر اسے اٹھتے بیٹھتے لعن و طعن کر رہا ہے۔ لعنت بھیج رہا ہے۔ اس پر وہ چین نہیں لے سکتی۔ اس کی روح اسے قرار نہیں لینے دیتی۔

انور سوچو کیا وہ زندہ در جہنم نہیں۔ کیا جہنم کسی دوسری چیز کا نام ہے کیا دنیا ہی میں اپنی جہنم اپنے ہی ہاتھوں اس نے تیار نہیں کرلی اور کیا پھر وہ دن رات اس جہنم کی بے پناہ آگ میں بھن نہیں رہی انور، وہ جل رہی ہے وہ پھکی جا رہی ہے اس نے ایک غلطی کی تھی اور شاید پہلی اور آخری غلطی ۔ ایک غلطی صرف ایک قصور پر یہ سزا! مگر ہمیں کسی گناہگار کا مضحکہ اڑانا۔ اس کے گناہ کو منظر عام پر لاکر اسے گھناؤنا بنانا کس حد تک جائز ہے۔ گناہ .... آہ .... کون ہے جو گناہگار نہیں۔ سچ کہنا انور کیا ہم تم نے کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہوگا۔ اس تلخ حقیقت سے کیوں چشم پوشی کرتی ہو انور۔ میں دیکھتا ہوں کہ شراب خانہ سے لوٹتا ہوا رند اور حرم محترم کے بلند ترین مینارہ پر کھڑا ہو کر اللہ اکبر کی صدا بلند کرنے والا مقدس انسان ایک ہی صف میں کھڑے ہیں۔ نہیں شراب خانے والا انسان پھر بھی اچھا ہے اس لئے کہ اسے اعتراف گناہ ہے۔ وہ سہم رہا ہے۔ پاداش گناہ کے خوف سے لرز رہا ہے اپنی کم بختیوں کے عذاب کے تصور سے اپنی کوتاہیوں کے عرفان سے مگر وہ وہاں وہ مغرور زاہد مبتلا ہے مبتلا ہوتا جا رہا ہے اپنی فرضی جنت کے حصول کے فریب میں۔ اس کا تقشف ایک حسین پردہ ہے۔ اس کے گناہوں کا۔ اس کا ظاہری تقدس دھوکہ کی ٹٹی ہے۔ فلسفہ گناہ۔ آہ! کیوں پڑتی ہو انور تم ان گورکھ دھندوں میں تمہیں کسی کے عذاب و گناہ کے مواخذہ کا حق کب حاصل ہے۔ وہ گناہگار ہم پارسا

ہم زاہد، ہم برگزیدۂ وخدا رسیدہ، انور خطاپوشی اور عطا پاشی سے ہم کیوں نہ کام لیں، "مارا ازیں چہ کار کہ ایں آمد و آں رفت" انور مجھے ارشد کی محبت چھیننے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے اس سے بے حد محبت ہے میں نے اسے بڑی مشکلوں سے پالا ہے۔ جب یہ میرے پاس میرے ایک عزیز دوست کے ذریعہ لایا گیا تھا۔ ایک مضغۂ گوشت تھا۔ ایک لوتھڑا میں نے رات دن ایک کر کے اُسے زندہ رکھنا ہے۔ اب تو یہ کافی ہوشیار ہو گیا ہے انور۔ اسے اگر ہم اپنی اولاد سمجھ لیں تو کیا مضائقہ ہوگا۔ ایسا کرنے سے ہماری شفقت کو ٹھیس نہ لگنی چاہئے انور، انور تمہارے سینے میں تو عورت کا دل ہے، ماں کا دل ہے۔

"شفقت کی بھیک ایک حرامی بچہ کے لئے میں آپ کو ارشد سے محبت کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی، لیکن مجھے ارشد سے محبت کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ حرام نوازی آپ کو مبارک ہو"

"انور" انور" اتنی سنگدل ہو انور تم

دوسرے روز صبح وکیل صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے۔ ان کے چہرے سے انہماک تام اور انقباض طبع کی علامتیں برس رہی تھیں۔ انور مسکراتی ہوئی آئی اور ایک خط کو جو وکیل صاحب کے روبرو کھلا ہوا پڑا تھا۔ اٹھا کر زور زور سے پڑھنے لگی

مگر منا
امید کہ ایک دل جلی مامتا کی ماری ماں کی پہلی اور آخری تمنا کو
شرفِ پذیرائی بخش کر اپنی کریم النفسی کا ثبوت دیں گے۔ یعنی
اسے اس کے لختِ جگر کی ایک جھلک دکھا کر عنداللہ ماجور
ہوں گے۔ کہیے کب آؤں!

"دل جلی سکینہ"

"سکینہ۔ سمجھی۔ خوب" انور نے کہا "ہاں تو یہ آپ کی سکینہ خانم
کب آ رہی ہیں۔ آپ اتنے اوسان باختہ کیوں ہیں۔ اے" بادِ صبا ایں
ہمہ آوردۂ تست" ارشد اور سکینہ خانم آپکی تمام زندہ دلیوں پر بھوت
کی طرح مسلط ہو گئے ہیں۔ جب دیکھو یہی دھن۔ جب پوچھو یہی خبط،
بلا لیجیے نا۔ دے کیوں نہیں دیتے جواب کے فوراً آجاؤ۔ میرا کیا میں
اور کہیں جا رہی ہوں گی اور پھر دلی ہے کتنی دور، آپ کی دلچسپیوں اور
رنگینیوں میں مخل ہونے والی ہیں کون؟ اگر آپ یہ چاہتے ہوں کہ میری
موجودگی میں آپ کی سکینہ خانم میری ڈیوڑھی پر قدم رکھیں، تو یہ ناممکن
ہے۔ آپ شوق سے انھیں بلا لیجیے۔ ان کے وجودِ نامسعود سے اپنے
ویرانے کی زینت بڑھائیے۔ لیکن یہ سب کچھ اس وقت کیجیے جب
میں دہلی پہنچ چکی ہوں ۔۔۔۔ ورنہ

"ورنہ" انور کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔ سکینہ ہماری مہمان ہو کر
آ رہی ہے۔ تم دلی چلی جاؤ گی۔ یعنی اسے نہ آنے دو گی۔ اسے ارشد

کو ایک جھلک نہ دیکھنے دینا کتنی دل شکنی کا موجب ہوگا انور اسے دنیا نے ٹھکرا دیا ہے۔ اسے اس کے گھر والے منہ نہیں لگاتے وہ خود مر رہی ہے۔ اسے دلجوئی کی ضرورت ہے۔ اس پر رحم کرنا چاہئے انور۔ وہ ہمارا تمہارا کیا چھین لے گی۔ ایک دن رہے گی اور چلی جائے گی۔ اچھا اسے میں کسی ہوٹل میں ٹھہرا دوں گا۔ وہاں ارشد کو لے جاؤں گا۔ مگر سوچو تو سہی وہ اپنے دل میں کیا کہے گی۔ یہ اس کی کھلی ہوئی ذلت ہوگی۔ وہ کافی ذلت اٹھا چکی ہے وہ کب تک یہ ذلتیں اٹھاتی رہے گی، انور ہمارے دو تشفی آمیز جملے اس کی ویران دنیا کو تھوڑی دیر کے لئے سرسبز کر دیں گے۔

"میں کہہ چکی اور یہی میرا فیصلہ ہے کہ میرے ہوتے ہوئے اس گھر میں آپ کی سکینہ خانم نہ آئیں گی۔ اور اگر آپ اس کے لانے پر مصر ہی ہیں تو۔۔۔۔۔عورت کی رقیق القلبی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں آپ"

نہیں انور تم رنجیدہ نہ ہو وہ نہ آئے گی۔ تم نہ چاہو اور وہ نہ آ جائے۔ ناممکن۔ میں نے اسے آنے سے روک دیا ہے۔ اسے تار دے دیا ہے کہ وہ آنے کا قصد ترک

کر دے۔

دوسرے روز پوسٹ مین نے ایک تار لا کر دیا۔ انور نے جلدی جلدی کھول کر پڑھنا شروع کیا:-

"ریچنگ نائنٹ ٹرین"

سکینہ

وکیل صاحب ششدر رہ گئے۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ انور وہ آ رہی ہے۔ میں نے منع کر دیا تھا۔ پھر بھی آ رہی ہے۔ انور وہ۔ آ گئی تو نہیں میں اسے گھر نہیں لاؤں گا۔ میں تمہیں ناراض کروں گا۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں ناخوش کر کے خوش نہیں رہ سکتا۔ خوش نہ رہ سکوں گا۔ اسے اسٹیشن ہی سے واپس کر دوں گا۔ ارشد کو ایک جھلک دکھا کر واپس لاؤں گا اسے کچھ روپیہ دے دوں گا۔ تاکہ وہ چاہے تو کسی ہوٹل میں ٹھہر سکے۔"

"نہیں سکینہ آئے گی وہ اسی گھر میں رہے گی۔ جب تک اس کا جی چاہے گا رہے گی۔ وہ ارشد کو دیکھے گی۔ ایک جھلک نہیں بلکہ خوب جی بھر کر شاید تمام عمر"

وکیل صاحب کا چہرہ مسرت سے تمتما اٹھا: کیا کہہ رہی ہو۔ انور مذاق کر رہی ہو: سچ کہہ رہی ہو۔ اچھی انور، پیاری انور"، " ایں چہ احسان است قربانِ شوم" سکینہ آئے گی۔ ارشد کی ماں آئے گی۔ انور اسے نوازے گی۔ اپنی شفقتوں سے اس کے قلب مجروح پر تشفی کا پھاہا رکھے گی۔ میری انور، ماہ جبیں انور، کریم انور، رحیم انور۔ اپنی ستم زدہ بہن کے دکھے ہوئے دل پر محبت کا پھاہا رکھیں گی۔ زندہ باد انور زندہ باد"

گاڑی کا وقت قریب ہے ہمیں چلنا چاہئے انور نے موٹر ڈرائیور کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ وکیل صاحب آپ تھکے ہوئے ہیں۔ آرام فرمائیے۔ میں جاتی ہوں اور سکینہ کو اگر وہ آگئیں لاتی ہوں۔ انور نے محبت بھرے لہجہ میں کہا"

وکیل صاحب انور پر شباب انور۔ مجسمہ ناز انور کے منہ سے نکلے ہوئے ہر ہر لفظ پر بچھے جا رہے تھے۔ وہ انور سے محبت کرتے تھے بے پناہ، وہ انور کو چاہتے تھے بے تحاشا۔ لیکن ان کی نظر آہ ان کی حریص نظر آج انور کے وجود پر عجب طریقہ سے

پڑ رہی تھی ۔ وہ انور کو ایک ہی نظر میں جذب کر لینا چاہتے تھے ۔ وہ ملائک فریب انور حسن لب بیٹ کو اپنی نظر کے تنگ دامن میں بیک نگاہ سمیٹ لینا چاہتے تھے آج ان کا جذبۂ پرستش پورے شباب پر تھا ۔ انور کی پیشانی پر ایک طویل ایک بے انتہا پُر کیف بوسہ ثبت کرتے ہوئے وکیل صاحب نے کہا ۔ اچھا جاؤ خدا حافظ ، انور جلد آنا ۔ میں بے چینی سے انتظار کروں گا ۔ دیکھو کہیں سکینہ کو لے کر سینما وغیرہ نہ چلد ینا میں تمہارا انتظار کروں گا ۔ سکینہ کا بھی ، لیکن تمہارا انتظار زیادہ شدت کے ساتھ......۔

وکیل صاحب پائیں باغ کے برآمدے میں بےچینی سے ٹہل رہے تھے ۔ موٹر کا ہارن سنائی دیا ۔ لپکے ہوئے صدر دروازے پر گئے ۔ موٹر قریب آکر رُکی ۔ انور دوڑی ہوئی آئی ۔ وکیل صاحب کے گلے میں اپنے دستِ مرمریں حمائل کر کے بولیں ۔ آپ کی سکینہ آگئیں ۔ بڑی اچھی ہیں بے چاری ۔ میں تو انھیں اب یہاں سے نہ جانے دوں گی ۔ وہ اب یہیں رہیں گی ۔ ارشد کو کھلائیں گی ۔ آپ کی خدمت کریں گی ۔

وکیل صاحب نے موٹر کا جائزہ لیتے ہوئے
کہا "کہاں ہے سکینہ! انور۔ مذاق کر رہی ہو"
"پیارے سلیم سکینہ آپ کے روبرو ہے"
قدموں پر گرتے ہوئے "سکینہ قدم چوم رہی
ہے۔
"انور کیا کہہ رہی ہو۔ میری انور سکینہ کیوں
ہو سکتی ہے؟"
"پیارے سلیم آپ کی انور صرف سکینہ ہی نہیں
جمیلہ بھی ہے"
"کیسی باتیں کر رہی ہو انور
"پیارے سلیم اپنی انور کو معاف کر دو، سلیم
سکینہ کو بخش دو" انور سچ کہو کیا معاملہ ہے، ارشد
کی ماں سکینہ میری محبوب۔ میری بیوی انور"
"ہاں پیارے سلیم، ارشد کی ماں سکینہ ارشد
کا باپ سلیم"
"سلیم ارشد کا باپ!! کیا کہہ رہی ہو انور"
"۲۴ دسمبر ۱۹۴۲ء کی سخت تاریک رات ساون
کا مہینہ۔ برڈوڈ کا سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم" دو مست
شباب الھڑ دیوانوں کا تصادم۔ ولولہ انگیز و پرشوق

جوانیوں کا ہیجان ، دو طوفان خیز آندھیوں کا اتصال "پھر فوری جدائی اور پھر ارشد کی ولادت!! اور پُر اسرار طریقے سے ننھے سے ارشد کا سکینہ کے طویل غم نامے کے ساتھ آپ کے پاس آنا۔ پھر سکینہ عرف انور سے کچھ عرصہ سے بعد آپ کا عقد —— میں دو بیویوں کا شوہر نہیں بننے دوں گی۔ تم کو سلیم چاہے انور کے ہزار نام رکھدو۔ انور نے سلیم کے گلے میں ہاتھ حمائل کر کے کہا۔

~~~~~※~~~~~
~~~~~

ختم شد